

واقعہ اصحاب کھف (ایک جملہ)

سورہ کھف آیت ۹ سے اصحاب کھف کی سرگذشت شروع ہوئی
اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

یہ چند نوجوان تھے جنہوں نے اللہ کی رحمت پر بھروسہ کیا تھا۔ اور ایک پہاڑ کے غار میں جا چھپے تھے۔ کئی برسوں تک یہ اس میں پوشیدہ رہے۔ آبادی سے ان کا کوئی تعلق نہ رہا۔ زندگی کی کوئی صدا، ان کے کانوں تک نہیں پہنچتی تھی۔ پھر وہ اٹھائے گئے، یعنی ظاہر ہوئے اور یہ سارا معاملہ اس لئے ہوا کہ واضح ہو جائے، کہ دونوں جماعتوں میں سے کون سی جماعت ایسی تھی جو اس وقت کے واقعات اور ان کے نتائج کا بہتر اندازہ کر سکتی تھی۔ دو جماعتوں سے مقصود اصحاب کھف اور ان کی قوم و ملک کے لوگ ہیں۔

یہ گویا اس تمام معاملے کا حصل ہے۔ اس کے بعد اس کی ضروری تفصیلات آتی ہیں۔ چنانچہ آیت ۱۳ میں فرمایا۔
خُنْ نَصْ عَلَيْكَ بِأَهْمَّ بِالْحَقِّ
(الف)

ایک گمراہ اور ظالم قوم سے چند حق پرست نوجوانوں کا کنارہ کشی کر لینا اور ایک پہاڑ کے غار میں جا کر پوشیدہ ہو جانا۔ ان کی قوم چاہتی تھی کہ انہیں سنگار کر دے یا جبراً اپنے دین میں واپس لے آئے۔ انہوں نے دنیا چھوڑ دی مگر حق سے منہ نہ موڑا۔

(ب)

جب وہ غار میں اٹھے تو اس کا اندازہ نہ کر سکے کہ کتنے عرصہ تک یہاں رہے ہیں۔ انہوں نے اپنا ایک آدمی شہر میں کھانا لانے کیلئے بھیجا۔ اور کوشش کی کہ کسی کو خبر نہ ہو۔ لیکن حکمت الہی کا فیصلہ دوسرا تھا۔ خبر ہو گئی اور یہ معاملہ لوگوں کیلئے تذکیرہ و عبرت کا موجب ہوا۔

(ج)

جس قوم کے ظلم سے عاجز ہو کر انہوں نے غار میں پناہی تھی وہی ان کی اس درجہ معتقد ہوئی کہ ان کے مرقد پر ایک ہیکل تعمیر کیا گیا۔ اس واقعہ کی تفصیلات لوگوں کو معلوم نہیں۔ طرح طرح کی بتیں مشہور ہو گئی ہیں۔ بعض کہتے ہیں وہ تین آدمی تھے۔ بعض کہتے ہیں پانچ تھے۔ بعض کہتے ہیں سات تھے۔ مگر یہ سب اندر ہی میں تیر چلاتے ہیں۔ حقیقت حال اللہ ہی کو معلوم ہے اور غور کرنے کی بات یہ نہیں ہے کہ ان کی تعداد کتنی تھی؟ دیکھنا چاہیے کہ ان کی حق پرستی کا کیا حال تھا؟

مسیحی مذہب کے ابتدائی قرون میں متعدد واقعات ایسے گزرے ہیں کہ راسخ الاعتقاد عیسائیوں نے مخالفوں کے غاروں میں پناہ لے لی۔ اور آبادیوں سے کنارہ کش ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہیں وفات پا گئے اور ایک عرصہ کے بعد ان کی نعشیں برآمد ہوئیں۔ چنانچہ ایک واقعہ خود روم کے اطراف میں گذر ا تھا۔ ایک انطاکیہ کی طرف منسوب ہے۔ ایک افس میں بیان کیا جاتا ہے۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سورہ میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ کہاں پیش آیا تھا؟ قرآن نے کھف کے ساتھ الر قیم کا لفظ بھی بولا ہے اور بعض آئمہ تابعین نے اس کا یہی

مطلوب سمجھا تھا کہ یہ ایک شہر کا نام ہے۔ لیکن چونکہ اس نام کا کوئی شہر عام طور پر مشہور نہ تھا۔ اس لئے اکثر مفسر اس طرف چلے گئے کہ یہاں ر قیم کے معنی کتابت کے ہیں۔ یعنی ان کے غار پر کوئی کتبہ لگادیا گیا تھا۔ اس لئے کتبہ والے مشہور ہو گئے۔

الر قیم

لیکن اگر انہوں نے تورات کی طرف رجوع کیا ہوتا تو معلوم ہو جاتا کہ الر قیم وہی لفظ ہے، جسے تورات میں "را قیم" کہا گیا ہے، اور یہ فی الحقيقة ایک شہر کا نام تھا۔ جو آگے چل کر "پیٹر" کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اور عرب اسے "بطر" کہنے لگے۔ عالمگیر جنگ کے بعد آثار قدیمہ کی تحقیقات کے جو نئے نئے گوشے کھلے ہیں، ان میں ایک پیٹر ابھی ہے۔ اور اس کے اکتشافات نے بحث و نظر کا ایک نیا میدان مہیا کر دیا ہے۔ جزیرہ نماۓ سینا اور خلیج عقبہ سے سیدھے شمال کی طرف بڑھیں تو پہاڑی سلسلے متوازی شروع ہو جاتے ہیں۔ اور سطح زمین بلندی کی طرف اٹھنے لگتی ہے۔ یہ علاقہ نبطی قبائل کا علاقہ تھا۔ اور اس کی ایک پہاڑی سطح پر راقیم نامی شہر آباد تھا۔ دوسری صدی عیسوی میں جب رومیوں نے شام اور فلسطین کا الحاق کر لیا، تو یہاں کے شہروں کی طرح راقیم نے بھی ایک رومی نوابی کی حیثیت اختیار کر لی اور یہی زمانہ ہے جب پیٹر کے نام سے اس کے عظیم الشان مندوں اور تھیڑوں کی شہرت دور دور تک پہنچی۔ 640 عیسوی میں جب مسلمانوں نے یہ علاقہ فتح کیا تو راقیم کا نام بہت کم زبانوں پر رہا۔ یہ رومیوں کا پیٹر، اور عربوں کا بطر اتھا۔

جنگ کے بعد سے اس علاقہ کی از سر نوازی پیٹر کی جا رہی ہے اور نئی نئی باتیں روشنی میں آ رہی ہیں۔ ازاں جملہ اس علاقہ کے عجیب و غریب غار ہیں جو دور دور تک چلے گئے ہیں۔ اور نہایت و سیع ہیں۔ نیز اپنی نوعیت میں ایسے واقع ہوئے ہیں کہ دن کی روشنی کسی طرح بھی ان کے اندر نہیں پہنچ سکتی۔ ایک غار ایسا بھی ملا ہے، کہ جس کے دہانے کے پاس قدیم عمارتوں کے آثار پائے جاتے ہیں اور بے شمار ستونوں کی کرسیاں شناخت کی گئی ہیں۔ خیال کیا گیا ہے کہ یہ کوئی معبد ہو گا۔ جو یہاں تعمیر کیا گیا تھا۔

اس اکتشاف کے بعد قدرتی طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ اصحاب کہف کا واقعہ اسی شہر میں پیش آیا تھا۔ اور قرآن نے صاف صاف اس کا نام "ار قیم" بتلا دیا ہے۔ اور جب اس نام کا ایک شہر موجود تھا، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ راقیم کے معنی میں غیر ضروری تکلفات کیے جائیں۔ بغیر کسی بنیاد کے اسے "کتبہ" پر محمول کیا جائے۔ علاوہ بر ایں دوسرے قرآن بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔

قرآن نے جس طرح اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کی عرب میں شہرت تھی۔ لوگ اس بارے میں بحثیں کیا کرتے تھے۔ اور اسے ایک نہایت ہی عجیب و غریب بات تصور کرتے تھے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ مشرکین عرب کے وسائل معلومات محدود تھے۔ بہت کم امکان ہے کہ ڈور دراز کی باتیں ان کے علم میں آتی ہوں۔ پس یہ ضروری ہے کہ یہ قرب و جوار ہی کی کوئی بات ہو اور ان لوگوں کی زبانی سنی جاسکے، جن سے ہمیشہ عربوں کا ملنا جلتا رہتا ہو۔ ایسے لوگ کون ہو سکتے تھے؟ اگر اسے "پیٹر" کا واقعہ قرار دیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

اول تو خود یہ مقام عرب سے قریب تھا۔ یعنی عرب کی سرحد سے ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ ثانیاً نبطیوں کی وہاں آبادی تھی۔ اور نبطیوں کے تجارتی قافلے برابر حجاز میں آتے رہتے تھے۔ یقیناً، نبطیوں میں اس واقعہ کی شہرت ہو گئی اور انہی سے عربوں نے سنا ہو گا۔ خود قریش مکہ کے تجارتی قافلے بھی ہر سال شام جایا کرتے تھے۔ اور سفر کا ذریعہ وہی شاہراہ تھی۔ جورو میوں نے ساحل خلیج سے لے کر ساحل مار مورا تک تعمیر کر دی تھی، پیغمبر اسی شاہراہ پر واقع تھا۔ بلکہ اس نواحی کی سب سے پہلی تجارتی منڈی تھی۔ اس لئے اس سے زیادہ قدر تی بات اور کیا ہو سکتی ہے، کہ یہ واقعہ ان کے علم میں آگیا ہو۔ اس سلسلہ میں چند باتیں اور تشرح طلب ہیں۔

جنگ کے بعد اس شاہراہ کا سرائے لگایا گیا تو یہ پوری طرح نمایاں ہو گئی۔ اب یہ اپنے اصلی خط پر دوبارہ تعمیر کی جا رہی ہے۔ اور عقبہ سے عمان تک تعمیر ہو چکی ہے۔ آج کل جہاں عقبہ ہے، وہاں پہلے ترسیں آباد تھا۔ جہاں سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے جہاز ہندوستان جایا کرتے تھے۔ اور بحیرہ احمر کے تجارتی بیڑے کا مرکز تھا۔

جاری ہے
اصل واقعہ

(الف) آیت ۹

ام حسبت ان اصحاب الکھف والر قیم کانوا من لیتنا عجبًا
کا اسلوب خطاب صاف کہہ رہا ہے کہ کچھ لوگ "اصحاب الکھف والر قیم" کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا معاملہ قدرت الہی کا ایک عجیب و غریب کرشمہ سمجھا جاتا ہے۔ لوگوں نے پیغمبر اسلام سے ان کا ذکر کیا ہے اور اب وہی اس معاملہ کی حقیقت واضح کر رہی ہے۔ چنانچہ پہلے مجمل اس کا خلاصہ اور نتیجہ بتلادیا کہ جو کچھ پیش آیا تھا وہ اس سے زیادہ نہیں ہے اور جو کچھ عبرت و تذکیر کی بات ہے وہ یہ ہے۔ پھر۔ آیت (۱۳) میں فرمایا۔

"نَحْنُ نَقْصَ عَلَيْكَ بِأَهْمَ بِالْحَقْ"

اب ہم تجھے ان کی سچی خبر سنادیتے ہیں یعنی واقعہ کی چند ضروری تفصیلات بیان کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد تفصیلات بیان کی ہیں۔

یہ مجمل خلاصہ جو آیت (۱۰) سے (۱۲) تک بیان کیا ہے۔ تمام سرگذشت کا حاصل ہے۔ اس کی روشنی میں بقیہ تفصیلات پڑھنی چاہئیں۔
فرمایا۔

چند نوجوان تھے جنہوں نے سچائی کی راہ میں دنیا اور دنیا کی راحتوں سے منہ موڑا اور ایک غار میں پناہ گزیں ہو گئے۔ ان کے پیچھے ظلم و ستم کی قوتیں تھیں۔ سامنے غار کی تاریکی، وحشت، تاہم وہ ذرا بھی ہر اساح نہ ہوئے۔ انہوں نے کہا۔ "خدا یا تیری ہی رحمت کا آسراء ہے اور تیری ہی چارہ سازی کا بھروسہ"۔ چنانچہ کئی سال تک وہوں رہے اور اس طرح رہے کہ دنیا کی صد اؤں کی طرف سے ان کے کان بالکل بند تھے۔ پھر ہم نے انہیں اٹھا کھڑا کیا تاکہ واضح ہو جائے۔ ان دونوں جماعتوں میں سے کون گروہ تھا جس نے اس عرصہ میں نتائج عملی کا بہتر اندازہ کیا ہے؟ یعنی صورت حال نے دو جماعتوں پر پیدا کر دی تھیں۔ ایک اصحاب کہف تھے، ایک ان کے مخالف۔ ایک نے حق کی پیروی کی، دوسرا نے ظلم و تشدد پر کمر باندھی۔ یہ چند برسوں کی مدت دونوں جماعتوں پر گزری تھی۔ اس پر بھی جو غار میں پناہ لینے پر مجبور ہوئی اور اس پر بھی جس نے غار میں پناہ لینے پر مجبور کیا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ دونوں میں سے کس نے کیا کھویا ہے؟ اور کس نے کیا کھویا ہے؟ کون ان دونوں میں وقت کا بہتر اندازہ شناس تھا؟

چنانچہ آگے چل کر جو تفصیلات آتی ہیں۔ ان سے واضح ہو جاتا ہے کہ ظالم جماعت کے ظلم کی عمر بہت تھوڑی تھی۔ اور بالآخر وہی راہ فتح مند ہونے والی تھی جو اصحاب کہف نے اختیار کی تھی۔ کیوں کہ بالآخر مسیحی دعوت تمام ملک میں پھیل گئی۔ اور جب کچھ عرصہ کے بعد وہ غار سے نکلے اور ایک آدمی کو آبادی میں بھیجا تو اب مسیحی ہونا کوئی ناقابل معافی جرم نہیں تھا، عزت و سربراہی کی سب سے بڑی عظمت تھی۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان پر ستاراں حق کی استقامت ہی تھی، جس نے دعوتِ حق کو فتح مند کیا۔ اگر وہ مظالم سے تنگ آ کر اتباعِ حق سے دست بردار ہو جاتے تو یقیناً یہ انقلاب ظہور میں نہیں آتا۔ (ب) اس کے بعد واقعہ کی بعض تفصیلات واضح کر دی گئی ہیں۔ جو لوگ خدا پرستی کی راہ اختیار کرتے تھے۔ ان کی مخالفت میں تمام باشندے کمر بستہ ہو جاتے۔ اور اگر وہ اپنی روشن سے بازنہ آتے تو سنگسار کر دیے جاتے۔ یہ حالت دیکھ کر انہوں نے فیصلہ کیا کہ آبادی سے منہ موڑیں۔ اور کسی غار میں معتکف ہو کر ذکر الہی میں مشغول ہو جائیں۔ چنانچہ ایک غار میں اعتکاف اختیار کیا۔

غار کی نوعیت:

ان کا ایک وفادار کتا تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ غار میں چلا گیا۔ جس غار میں انہوں نے پناہی، وہ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اگرچہ اندر سے کشادہ ہے، اور دہانہ کھلا ہوا۔ لیکن سورج کی کرنیں اس میں راہ نہیں پاسکتیں۔ نہ چڑھتے دن میں نہ ڈھلتے دن میں۔ جب سورج نکلتا ہے تو اپنی جانب رہتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ جب ڈھلتا ہے تو بائیں جانب رہتے ہوئے غروب ہو جاتا ہے۔ یعنی غار اپنے طول میں شمال و جنوب رویہ واقع ہے۔ ایک طرف دہانہ ہے۔ دوسری طرف منفذ۔

روشنی اور دونوں طرف سے آتی ہے۔ لیکن دھوپ کسی طرف سے بھی راہ نہیں پاسکتی۔ اس صورت حال سے بیک وقت دو باشندے معلوم ہوئیں۔
جاری ہے

گزشتہ سے پیوستہ

ان کا ایک وفادار کتا تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ غار میں چلا گیا۔ جس غار میں انہوں نے پناہی، وہ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اگرچہ اندر سے کشادہ ہے، اور دہانہ کھلا ہوا۔ لیکن سورج کی کرنیں اس میں راہ نہیں پاسکتیں۔ نہ چڑھتے دن میں نہ ڈھلتے دن میں۔ جب سورج نکلتا ہے تو دہنی جانب رہتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ جب ڈھلتا ہے تو بائیں جانب رہتے ہوئے غروب ہو جاتا ہے۔ یعنی غار اپنے طول میں شمال و جنوب رویہ واقع ہے۔ ایک طرف دہانہ ہے۔ دوسرا طرف منفذ۔

روشنی اور ہوادونوں طرف سے آتی ہے۔ لیکن دھوپ کسی طرف سے بھی راہ نہیں پاسکتی۔ اس صورت حال سے بیک وقت دوباریں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ زندہ رہنے کیلیے وہ نہایت محفوظ اور موزوں مقام ہے۔ کیونکہ ہو اور روشنی کی راہ موجود ہے۔ مگر دھوپ کی تپش نہیں پہنچ سکتی۔ پھر اندر سے کشادہ ہے، جگہ کی کمی نہیں۔ دوسرا یہ کہ باہر سے دیکھنے والوں کیلیے اندر کا منظر بہت ڈراونا ہو گیا ہے۔ کیونکہ روشنی کے منافذ موجود ہیں اس لیے بالکل اندر ہی نہیں رہتا۔ سورج کسی وقت سامنے آتا نہیں اس لیے بالکل اجالا بھی نہیں ہوتا۔ روشنی اور اندھیرے کی ملی جملی حالت رہتی ہے۔ اور جس غار کی اندر وہ فضا ایسی ہو۔ اسے باہر سے جھانک کر دیکھا جائے تو اندر کی ہر چیز ایک بھی انک منظر پیش کرے گی۔

یہ لوگ کچھ عرصہ تک غار میں رہے اس کے بعد نکلے تو انہیں کچھ اندازہ تھا کہ کتنے عرصہ تک اس میں رہے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے باشندوں کا وہی حال ہو گا جس حال میں انہیں چھوڑا تھا۔ لیکن اس عرصہ میں یہاں انقلاب ہو چکا تھا۔ اب غلبہ ان لوگوں کا تھا جو اصحاب کہف ہی کی طرح خدا پرستی کی راہ اختیار کر رکھتے تھے۔ جب ان کا ایک آدمی شہر میں پہنچا تو اسے دیکھ کر حیرت ہوئی۔

اب وہی لوگ جنہوں نے انہیں سنگار کرنا چاہتا۔ ان کے ایسے معتقد ہو گئے کہ ان کے غار نے زیارت گاہ عام کی حیثیت اختیار کر لی۔ اور امراء شہر نے فیصلہ کیا کہ یہاں ایک ہیکل تعمیر کیا جائے۔ اصحاب کہف نے یہ مدت کس حال میں بسر کی تھی؟ اس بارے میں قرآن نے صرف اس قدر اشارہ کیا ہے کہ فخر بناعلی آذان حرم فی الکھف سنین عدد۔

ضرب علی آذان کے صاف معنی تو یہ ہیں کہ ان کے کان دنیا کی طرف سے بند ہو گئے تھے۔ یعنی دنیا کی کوئی صدائیں تک نہیں پہنچتی تھیں۔ لیکن مفسرین نے اسے نیند پر محول کیا ہے۔

یعنی ان پر نیند طاری ہو گئی تھی۔ اور چونکہ نیند کی حالت میں آدمی کوئی آواز نہیں سنتا۔ اس لیے اس حالت کو "ضرب علی الآذان" سے تعبیر کیا گیا۔ اس تفسیر میں اشکال یہ ہے کہ عربی میں نیند کی حالت کیلیے ضرب علی الآذان کی تعبیر ملتی نہیں۔ لیکن وہ کہتے ہیں یہ ایک طرح کا استعارہ ہے۔ گہری نیند کی حالت کو ضرب علی الآذان کی حالت سے تشبیہ دی گئی۔

اصل یہ ہے کہ اصحاب کھف کا جو قصہ عام طور پر مشہور ہو گیا تھا، وہ یہی تھا کہ غار میں برسوں تک سوئے رہے۔ اس لیے یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ بعد کو بھی اس طرح کی روایتیں مشہور ہو گئیں۔ عرب میں قصہ کے اصلی راوی شام کے بنیٰ تھے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس قصہ کی اکثر تفصیلات تفسیر کے انہی راویوں پر جا کر منتہی ہوتی ہیں، جو اہل کتاب کے قصوں کی روایت میں مشہور ہو چکے ہیں۔ مثلاً حاک اور سیدی۔ بہر حال، اگر یہاں ضرب علی الاذان سے مقصود نیند کی حالت ہو تو پھر مطلب یہی قرار پائے گا کہ وہ غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت میں پڑے رہے۔ اور "ثم بعثنا ہم" کا مطلب یہ کہ ناپڑے گا کہ اس کے بعد نیند سے بیدار ہو گئے۔

یہ بات کہ ایک آدمی پر غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت طاری رہے۔ اور وہ پھر بھی زندہ رہے، طبی تجارت کے مسلمات میں سے ہے۔ اور اس کی مثالیں ہمیشہ تجربے میں آتی رہتی ہیں۔ پس اگر اصحاب کھف پر قدرت الٰہی سے کوئی ایسی حالت طاری ہو گئی ہو جس نے غیر معمولی مدت تک انہیں سلاٹے رکھا تو یہ کوئی مستعد بات نہیں۔ البتہ قرآن حکیم کی تصریح اس بارے میں ظاہر اور قطعی نہیں ہے اس لیے احتیاط اس میں ہے کہ حزم و یقین کے ساتھ کچھ نہ کہا جائے۔
وَحَسْبُهُمْ أَيْقَاظًا وَّهُمْ رَّوْدٌ

میں اس صورت حال کی طرف اشارہ کیا ہے جو نزول قرآن کے وقت تھی۔ یا جو حالت اس غار کی ایک مدت تک رہی۔ اس سے معلوم ہوا کہ انقلاب حال کے بعد اصحاب کھف نے غار کی گوشہ نشینی ترک نہیں کی تھی۔ اس میں رہے۔ یہاں تک کہ انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال کے بعد غار کی حالت ایسی ہو گئی کہ باہر سے کوئی دیکھنے تو معلوم ہو کہ زندہ آدمی موجود ہیں۔ دہانے کے قریب ایک کتا دونوں ہاتھ آگے کیے بیٹھا ہے۔ حالانکہ نہ تو آدمی زندہ ہیں، نہ کتابی زندہ ہے۔

جاری ہے

گزشتہ سے پیوستہ

یہ بات کہ ایک آدمی پر غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت طاری رہے۔ اور وہ پھر بھی زندہ رہے، طبی تجارت کے مسلمات میں سے ہے۔ اور اس کی مثالیں ہمیشہ تجربے میں آتی رہتی ہیں۔ پس اگر اصحاب کھف پر قدرت الٰہی سے کوئی ایسی حالت طاری ہو گئی ہو جس نے غیر معمولی مدت تک انہیں سلاٹے رکھا تو یہ کوئی مستعد بات نہیں۔ البتہ قرآن حکیم کی تصریح اس بارے میں ظاہر اور قطعی نہیں ہے اس لیے احتیاط اس میں ہے کہ حزم و یقین کے ساتھ کچھ نہ کہا جائے۔
وَحَسْبُهُمْ أَيْقَاظًا وَّهُمْ رَّوْدٌ

میں اس صورت حال کی طرف اشارہ کیا ہے جو نزول قرآن کے وقت تھی۔ یا جو حالت اس غار کی ایک مدت تک رہی۔ اس سے معلوم ہوا کہ انقلاب حال کے بعد اصحاب کھف نے غار کی گوشہ نشینی ترک نہیں کی تھی۔ اس میں رہے۔ یہاں تک کہ انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال کے بعد غار کی حالت ایسی ہو گئی کہ باہر سے کوئی دیکھنے تو معلوم ہو کہ زندہ آدمی موجود ہیں۔ دہانے کے قریب ایک کتا دونوں ہاتھ آگے کیے بیٹھا ہے۔ حالانکہ نہ تو آدمی زندہ ہیں، نہ کتابی زندہ ہے۔

لیکن باہر سے دیکھنے والا نہیں زندہ اور جاگتا کیوں سمجھے؟ اگر ان کی نعشیں پڑی ہیں تو نعشوں کو کوئی زندہ تصور نہیں کر سکتا۔ اگر رقد سے مقصود سونے کی حالت ہے اور وہ لیٹے ہوئے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک لیٹا ہوا آدمی دیکھنے والے کو جاگتا ہی دکھائی دے۔

مفسرین نے یہ اشکال محسوس کیا۔ لیکن اس کا کوئی حل دریافت نہ کر سکے۔ بعضوں نے کہا وہ اس لئے جاگتے دکھائی دیتے ہیں کہ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ لیکن اگر ایک بے حس و حرکت نعش پڑی دکھائی دے اور اس کی آنکھیں بھی ہوں تو دیکھنے والا سے ہوشیار و بیدار کیوں سمجھنے لگا؟ یہی سمجھے گا کہ مر گیا ہے۔ مگر آنکھیں کھلی رہ گئی ہیں۔ بعضوں نے کہا نقلبجم ذات الیمین و ذات الشمال کی وجہ سے وہ بیدار دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن چونکہ دائیں باعین کروٹ بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے دیکھنے والا خیال کرتا ہے۔ بیدار ہیں۔ لیکن یہ توجیہ پہلے سے بھی زیادہ بے معنی ہے۔ اول تو کروٹ بدلا بیداری کی دلیل نہیں۔ آدمی گھری سے گھری نیند میں ہوتا ہے۔ اور کروٹ بدلتا ہے۔ ثانیاً اگر کروٹ بدلتے ہوں گے تو کچھ وققے کے بعد بدلتے ہوں گے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ہر آن کروٹ بدلتے ہی رہتے ہوں۔ اور جب کبھی کوئی جھانک کر دیکھے انہیں کروٹ بدلتا ہی پائے۔ لطف یہ ہے کہ نقلبجم ذات الیمین و ذات الشمال کی تفسیر میں یہی مفسر ہمیں بتلاتے ہیں کہ بعضوں کے نزدیک سال میں دو دفعہ کروٹ بدلتی ہے، بعضوں کے نزدیک ایک دفعہ بعض کہتے ہیں تین سال بعد، بعض کہتے ہیں نو سال بعد۔ علاوه بر یہ قرآن نے یہ بات جس اسلوب و شکل میں بیان کی ہے۔

اس پر ان گفتہ وروں نے غور نہیں کیا۔

لواطلعت علیهم ولیت منجم فرار اولملست منجم رغبا۔

یعنی غار کے اندر کا منظر اس درجہ دہشت انگیز ہے کہ اگر تم جھانک کر دیکھو تو خوف کے مارے کانپ اٹھو۔ اور اٹھے پاؤں بھاگ کھڑے ہو۔ اس سے معلوم ہو اغار کے اندر اصحاب کھف کے اجسام نے ایسا منظر پیدا کر دیا ہے جو بے حد دہشت انگیز ہے اگر آدمی باہر سے دیکھے تو دیکھنے کے ساتھ ہی اس پر دہشت چھا جائے معا اٹھے پاؤں بھاگ کھڑا ہو۔ اب اگر اندر کا منظر صرف اتنا ہی تھا کہ چند آدمی لیٹے ہوئے ہیں اور آنکھیں کھلی ہوئی ہیں تو یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے اس درجہ دہشت انگیزی پیدا ہو سکے۔ علاوه بر یہ جو آدمی باہر سے جھانکے گا وہ انتباہ یک میں نہیں ہو سکتا کہ غار کی تاریکی میں لیے ہوئے آدمیوں کی آنکھیں بھی بے اول نظر دیکھ لے۔ اور وہ بھی اس حالت میں کہ داہنے یا باعین کروٹ پر لیٹے ہوں۔

در اصل یہ سارا معاملہ ہی دوسرا ہے۔ اور جب تک مفسرین کے پیدا کئے ہوئے تخيّل سے بالکل الگ ہو کر تحقیق نہ کی جائے۔ اصلیت کا سراغ نہیں مل سکتا۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جو حالت اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔ وہ کس وقت کی ہے؟ اس وقت کی ہے جب وہ نئے نئے غار میں جا کر مقیم ہوئے تھے؟ یا اس وقت کی جب انشاف حال کے بعد دوبارہ مختلف ہو گئے؟ مفسرین نے خیال کیا۔ اس کا تعلق پہلے وقت سے ہے۔ اور یہی بنیادی غلطی ہے۔ جس نے سارا الجھاؤ پیدا کر دیا ہے۔ دراصل اس کا تعلق بعد کے چالات سے ہے۔ یعنی جب وہ ہمیشہ کیلئے غار میں گوشہ نشین ہو گئے۔ اور پھر کچھ عرصہ بعد وفات پا گئے۔ تو غار کے اندر ورنی منظر کی یہ نوعیت ہو گئی تھی تھس بجم آینا خاؤ ہم روڈ میں ایقاظ سے مقصود ان کا زندہ ہونا ہے۔ اور رقد سے مردہ ہونا۔ نہ کہ بیدار اور خواب۔ چنانچہ عربی میں زندگی اور موت کیلئے یہ تعبیر عام معلوم ہوتی ہے۔ پھر یہ بات سامنے لانی چاہیے کہ یہ واقع مسیحی دعوت کی ابتدائی صدیوں کا ہے۔ اور جنمیں پیش آیا تھا۔ وہ عیسائی تھے۔ صرف اتنی بات پر غور کرنے سے سارا معاملہ حل ہو جاتا ہے۔ مسیحی دعوت کے ابتدائی قرون، ہی میں زہدا نزد اکی ایک خاص زندگی شروع ہو گئی تھی۔ جس نے آگے چل کر رہبانیت کی مختلف شکلیں اختیار کر لیں۔ اس زندگی کی ایک نمایاں خصوصیات یہ تھی کہ لوگ ترک علاائق کے بعد کسی پہاڑ میں یا کسی غیر آباد گوشہ میں مختلف ہو جاتے تھے۔

گزشتہ سے پیوستہ

مسیحی دعوت کے ابتدائی قرون، ہی میں زہدا نزد اکی ایک خاص زندگی شروع ہو گئی تھی۔ جس نے آگے چل کر رہبانیت کی مختلف شکلیں اختیار کر لیں۔ اس زندگی کی ایک نمایاں خصوصیات یہ تھی کہ لوگ ترک علاائق کے بعد کسی پہاڑ میں یا کسی غیر آباد گوشہ میں مختلف ہو جاتے تھے اور پھر ان پر استغراق عبادت کی ایسی حالت طاری ہو جاتی تھی کہ وضع و نشت کی جو حالت اختیار کر لیتے اس میں پڑے رہتے یہاں تک کہ زندگی ختم ہو جاتی۔ مثلاً اگر قیام کی حالت میں مشغول ہوئے تھے، تو بر کھڑے ہی رہتے اور اسی حالت میں جان دے دیتے۔ اگر گھٹنے کے بل رکوع کی حالت اختیار کی تھی تو یہی حالت آخر تک قائم رہتی۔ اگر سجدے میں سر کھل دیا تھا تو پھر سجدے ہی میں پڑے رہتے۔ اور مرنے کے بعد بھی اسی وضع میں نظر آتے۔ زیادہ تر گھٹنے کے بل رکوع کی وضع اختیار کی جاتی تھی۔ کیوں کہ عیسائیوں میں تعبد و تضرع کے لئے یہی وضع رائج ہو گئی تھی۔ غذا کی طرف سے یہ لوگ بالکل بے پرواہوتے تھے۔ اگر آبادی قریب ہوتی تو لوگ روٹی اور پانی پہنچا دیا کرتے، نہیں ہوتی تو یہ جستجو نہیں کرتے۔ عبادت کا استغراق جستجو کی مہلت ہی نہیں دیتا۔ اس اعتبار سے ان کی حالت ویسی ہی تھی۔ جیسی ہندوستان کے جو گیوں کی روہ چکی ہے۔ اور اب بھی گاہ نظر آ جاتی ہے۔ جس طرح زندگی میں انہیں کوئی نہیں چھیڑتا تھا، اسی طرح مرنے کے بعد بھی کوئی اس کی جرات نہ کرتا۔ متوں تک ان کی نعشیں اسی حالت میں باقی رہتیں جس حالت میں انہوں نے زندگی کے آخری لمحے بسر کئے۔

اگر موسم موافق ہوتا اور درمدوں سے حفاظت ہوتی تو صدیوں تک ڈھانچے باقی رہتے اور فاصلہ سے دیکھنے والا انہیں زندہ انسان تصور کرتا۔ چنانچہ ویکان کے تھانوں میں بے شمار ڈھانچے آج تک محفوظ ہیں، جو اس طرح کے مقامات سے برآمد ہوئے تھے، اور اپنی اصل وضع اور ہیئت پر باقی تھے۔

ابتداء میں اس غرض سے زیادہ تر پہاڑوں کی غاریں یا پرانی عمارتوں کے کھنڈ را اختیار کیے گئے تھے۔ لیکن آگے چل کر یہ طریقہ اس درجہ عام ہو گیا کہ خاص عمارتیں اس غرض سے تعمیر کی جانے لگیں۔ یہ عمارتیں اس طرح بنائی جاتی تھیں کہ ان میں آمد و رفت کے لیے کوئی دروازہ نہیں ہوتا تھا کیوں کہ

جو جاتا تھا، وہ پھر باہر نہیں نکلتا تھا۔ صرف ایک چھوٹی سی سلاخ دار کھڑکی رکھی جاتی تھی جوہر اور روشنی کا ذریعہ ہوتی اور اسی کے ذریعے لوگ غذا بھی پہنچادیتے۔

بعد کو جب مناسک ازم (رہبانیت) کے باقاعدہ ادارے قائم ہو گئے تو اس طرح کے انفرادی انزوں کی مثالیں کم ہوتی گئیں۔ تاہم تاریخ کی شہادت موجود ہے کہ ازمنہ وسطیٰ تک یہ طریقہ عام طور پر جاری تھا۔ اور یورپ کی کوئی آبادی ایسی نہ تھی جو اس طرح کی عمارتوں سے خالی ہو۔ ان مقامات کو عام طور پر Logette کہتے تھے اور جب ایک راہب یا راہبہ کا ان میں انتقال ہو جاتا تو ان پر لاطینی لفظ کندہ کر دیا جاتا TU-ORA یعنی اس کے لیے دعا کرو۔

تمام تاریخیں متفق ہیں کہ مسیحی رہبانیت سب سے پہلے مشرق میں شروع ہوئی۔ اور اس کا بڑا مرکز فلسطین اور مصر تھا۔ پھر چوتھی صدی مسیحی میں یہ پورپ پہنچی۔ اور سینٹ بنی ڈکٹ Benedict نے سب سے پہلے اس کے قواعد و ضوابط منضبط کئے۔ سینٹ بنی ڈکٹ نے بھی ایک پہاڑ کی غار ہی میں گوشہ نشینی اختیار کی تھی۔

مسیحی رہبانیت کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس کی ابتداء، اضطراری حالات سے ہوئی تھی۔ آگے چل کر اس نے ایک اختیاری عمل کی نوعیت پیدا کر لی۔ یعنی ابتداء میں لوگوں نے مخالفوں کے ظلم و تشدد سے مجبور ہو کر غاروں اور جنگلوں میں گوشہ نشینی اختیار کی۔ پھر ایسے حالات پیش آئے کہ اضطراری طریقہ زہد و تعبد کا ایک اختیاری اور مقبول طریقہ بن گیا۔ مزید تشریح اس مقام کی سورۃ حدید کی تشریحات میں ملے گی۔

بہر حال، معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب کھف کا معاملہ بھی تمام تر اسی نوعیت کا تھا۔ ابتداء میں قوم کے ظلم نے انہیں مجبور کیا تھا کہ غار میں پناہ لیں۔ لیکن جب کچھ عرصہ تک وہاں مقیم رہے تو زہد و عبادت کا استغراق کچھ اس طرح ان پر چھا گیا کہ پھر دنیا کی طرف لوٹنے پر آمادہ ہو سکے۔ اور گوملک کی حالت بدل چکی تھی، لیکن وہ بدستور غار ہی میں مستکف رہے۔ یہاں تک کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

انتقال اس حال میں ہوا کہ جس شخص نے ذکر و عبادت کی جو وضع اختیار کر لی تھی، وہی وضع آخری لمحوں تک باقی رہی۔ ان کے وفادار کتنے نے بھی آخر تک ان کا ساتھ دیا۔ وہ پاسبانی کے لیے دہانے کے قریب بیٹھا رہتا تھا۔ جب اس کے مالک مر گئے تو اس نے بھی وہیں بیٹھے بیٹھے دم توڑ دیا۔ اب اس واقعہ کے بعد غار کے اندر ورنی منظر نے ایک عجیب دہشت انگیز نوعیت پیدا کر لی۔ اگر کوئی باہر سے جھانک کر دیکھے تو اسے راہبوں کا ایک پورا مجمع ذکر و تعبد میں مشغول دکھائی دے گا۔ کوئی گھٹنے کے بل رکوع کی حالت میں ہے کوئی سجدے میں پڑا ہے کوئی ہاتھ جوڑے اور پر کی طرف دیکھ رہا ہے۔ دہانے کے قریب ایک کتنا ہے، وہ بھی بازو پھیلائے باہر کی طرف منہ کئے ہوئے ہے۔ یہ منظر دیکھ کر ممکن نہیں کہ آدمی دہشت سے کانپنے لٹھے۔ کیوں کہ اس نے یہ سمجھ کر جھانکا تھا کہ مردوں کی قبر ہے۔ مگر منظر جو دکھائی دیا وہ زندہ انسانوں کا ہے۔

اب اس واقعہ کے بعد غار کے اندر ونی منظر نے ایک عجیب دہشت انگیز نوعیت پیدا کر لی۔ اگر کوئی باہر سے جھانک کر دیکھے تو اسے راہبوں کا ایک پورا مجمع ذکر و تعبد میں مشغول دکھائی دے گا۔ کوئی گھٹنے کے بل رکوع کی حالت میں ہے کوئی سجدے میں پڑا ہے کوئی ہاتھ جوڑے اوپر کی طرف دیکھ رہا ہے۔ دہانے کے قریب ایک کتابی ہے، وہ بھی بازو پھیلائے باہر کی طرف منہ کئے ہوئے ہے۔ یہ منظر دیکھ کر ممکن نہیں کہ آدمی دہشت سے کانپنے لٹھے۔ کیوں کہ اس نے یہ سمجھ کر جہان کا تھا کہ مردوں کی قبر ہے۔ مگر منظر جو دکھائی دیا وہ زندہ انسانوں کا ہے۔

یہ تفسیر سامنے رکھ کر معاملہ کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے تو ہربات اس طرح واضح ہو جاتی ہے۔ گویا تمام قفلوں کو کھلنے کے لیے صرف ایک کنجی کا انتظار تھا۔

تَحْسِبُهُمْ أَيْقَاظًا وَ هُمْ رَقُودٌ

کامطلب بھی ٹھیک ٹھیک اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ کسی دور از کار توجہہ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کیونکہ اس طرح کا منظر یہی خیال پیدا کرے گا کہ لوگ زندہ ہیں۔ حالانکہ زندہ نہیں

لَوَاطْلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوِيْتَ مَنْخَمْ فَرَارُ الْمَلَكَتْ مَنْخَمْ رَعْبَا

کی علت بھی سامنے آگئی اور وہ تمام بے معنی تو جہیں غیر ضروری ہو گئیں، جن پر امام رازی مجبور ہوئے ہیں۔ اگر تم کسی قبر کے اندر جھانک کر دیکھو اور تمہیں مردہ نعش کی جگہ ایک آدمی نماز پڑھتا دکھائی دے تو تمہارا کیا حال ہو گا؟ یقیناً مارے دہشت کے چیز اٹھو گے۔ اس طرح "وَنَقْبَمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشَّمَاءِ"

کی تفسیر میں بھی کسی تکلف کی احتیاج باقی نہیں رہی۔ غار شمال و جنوب رویہ واقع تھا، اور ان دونوں جہتوں میں ہوا اور روشنی کے منافذ تھے۔ جیسا کہ آیت

وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ

سے مبارہ ہوتا ہے۔ پس بالمقابل منافذ ہونے کی وجہ سے ہوا برا بر اندر چلتی رہتی تھی۔ اور ان کے ڈھانچے داہنے سے بائیں اور بائیں سے داہنی جانب اس طرح متحرک رہتے تھے جیسے ایک زندہ آدمی ایک طرف سے پلٹ کر دوسرا طرف دیکھے۔

اس تفسیر کے بعد اس سوال کا جواب بھی خود بخود مل گیا کہ قرآن نے خصوصیت کے ساتھ یہ بات کیوں بیان کی کہ سورج کی کرنیں غار کے اندر نہیں پہنچتیں، جیسا کہ سورہ کہف کی آیت ۷۸ میں ہے اور کیوں اسے قدرت الہی کی ایک نشانی فرمایا کہ

ذَلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ

يَعْلَمُهُمْ هُوَ گیا کہ یہ دراصل اس بات کی تمہید تھی جو بعد میں آیت ۱۸ میں بیان کی گئی ہے کہ تَحْسِبُهُمْ أَيْقَاظًا وَ هُمْ رَقُودٌ

یعنی چونکہ یہ بات بیان کرنی تھی کہ مرنے کے بعد ان کی نعشیں عرصہ تک باقی رہیں۔ حتیٰ کہ دیکھنے والوں کو زندہ انسانوں کا گمان ہوتا تھا۔ اس لئے پہلے اس کی علت واضح کر دی کہ جس غار میں معتمک ہوئے تھے۔ وہ اس طرح کی غار تھی کہ انسانی جسم زیادہ سے زیادہ عرصہ تک اس میں قائم رہ سکتا تھا۔ کیونکہ سورج کی روشنی اس میں پہنچتی رہتی۔ لیکن سورج کی تپش کا اس میں گزرنہ تھا۔ جو چیز غش کو جلد گلا سڑا دیتی ہے وہ سورج کی تپش ہے۔ اور جو چیز تازگی پیدا کرتی ہے وہ ہوا اور روشنی ہے۔ ہوا چلتی رہتی، روشنی پہنچتی رہتی۔ مگر تپش سے پوری حفاظت تھی۔ "ذلک من آیات اللہ"
و بشوافی ^ص خصم ثالث مارت سین و اذاد او اتسعا۔ کا کیا مطلب ہے؟

کیا یہ خود قرآن کی تصریح ہے کہ وہ لوگ اتنی مت تک غار میں پڑے رہے؟ لیکن اگر ایسا ہے تو پھر اس کے بعد کیوں فرمایا کہ
"قل اللہ آعلم بمال بشوا"

مفسرین کو اس اشکال کو دور کرنے میں طرح طرح کے تکلفات کرنا پڑے۔ حالانکہ صاف مطلب وہی ہے جو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ یعنی جس طرح پہلے ان کی تعداد کے بارے میں لوگوں کے مختلف اقوال نقل کئے تھے، اسی طرح یہاں مت بقا کے بارے میں لوگوں کا قول نقل کیا ہے۔ یعنی لوگ کہتے ہیں کہ غار میں تین سو برس تک رہے۔ بعضوں نے اس پر نوسبر س اور بڑھادیے۔ تم کہدو، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ فی الحقيقة کتنی مت گزر چکی تھی۔

- پس یہ قرآن کی تصریح نہیں ہے لوگوں کا قول ہے۔ اور "سیقولون"
سے نقل اقوال کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، اس سلسلے کی یہ آخری کڑی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی ایسی ہی تفسیر مروی ہے۔
(ط) امام قرطبی نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ
"اوئلک قوم فنوا وعد موامنذ مدة طوليه"

یعنی اصحاب کہف کی موت پر ایک مت گزر چکی ہے۔ ان کے اجسام فنا ہو گئے۔ جس طرح ہر جسم فنا ہو جاتا ہے۔ ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شام کے غزووات میں بعض صحابہ کا گذر اصحاب کہف کی غار پر ہوا تھا اور انہیں ان کی ہڈیاں ملی تھیں۔ اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس سے اس کی بھی مزید تصدیق ہو گئی کہ یہ واقعہ پیڑا میں پیش آیا تھا۔ مسیحی رہبانیت کے طریقہ کی نسبت مندرجہ صدر بیان میں جو اشارات کیے گئے ہیں، ان کی تفصیلات کے لیے حسب ذیل کتابیں دیکھنی چاہئیں۔

. The Paradise or Garden of the Holy Fathers by E.A.W. Budge

The Evolution of the Monastic ideal by H. B. Workman

Five centuries of Religion by George Gordon Coulton

The Medieval Mind by Henry Osborn Taylor

اس سلسلے کی پچھلی اقسام میں مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے سورۃ کہف میں بیان کردہ اصحاب کہف کا ذکر اور تفسیر بیان کی تھی۔ اب یہ تحریر آگے بڑھتے ہوئے سورۃ کہف ہی میں مذکور ایک اور اہم شخصیت، ذوالقرنین کے ذکرے تک پہنچ گئی ہے۔

سورہ کہف میں تیر اواقعہ جو بیان کیا گیا ہے وہ ذوالقرنین کا ہے۔ کیوں کہ لوگوں نے اس بارے میں سوال کیا تھا۔ تمام مفسرین متفق ہیں کہ سوال یہودیوں کی جانب سے تھا۔ اگرچہ غالباً یہ سوال مشرکین مکہ کی زبانی ہوا۔ کیوں کہ یہ سورت مکی ہے۔ (یعنی مدینہ اور خیر کے یہودیوں نے ان سوالوں کو مشرکین مکہ کے حوالے کیا اور مشرکین مکہ نے ان سوالوں کے جواب بارگاہ رسالت سے حاصل کر کے واپس یہودیوں تک پہنچا دیے۔) قرآن نے ذوالقرنین کی نسبت جو کچھ بیان کیا ہے اس پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے تو حسب ذیل امور سامنے آجاتے ہیں۔

اولاً، جس شخصیت کی نسبت پوچھا گیا ہے۔ وہ یہودیوں میں ذوالقرنین کے نام سے مشہور تھا یعنی ذوالقرنین کا لقب خود قرآن نے تجویز نہیں کیا ہے بلکہ یہ پوچھنے والوں کا مجوزہ ہے۔ کیوں کہ فرمایا "وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ ذِي الْقَرْنَيْنِ"

ثانیاً، اللہ نے اپنے فضل و کرم سے اسے حکمرانی عطا فرمائی تھی۔ اور ہر طرح کا ساز و سامان جو ایک حکمران کے لیے ہو سکتا تھا۔ اس کے لیے فراہم ہو گیا تھا۔

ثالثاً، اس کی بڑی مہمیں تین تھیں۔ پہلے مغربی ممالک فتح کئے، پھر مشرقی ممالک، اور پھر ایک ایسے مقام تک فتح کرتا ہو اچلا گیا جہاں پہاڑی درہ تھا اور اس کی دوسری طرف یا جوں ج اور ما جوں ج آکر لوٹ مار مچایا کرتے تھے۔

رابعاً، اس نے وہاں ایک محکم سد (دیوار) تعمیر کر دی اور یا جوں ج و ما جوں ج کی راہ بند ہو گئی۔

خامساً، وہ ایک عادل حکمران تھا۔ جب وہ مغرب کی طرف فتح کرتا ہوا، ڈور تک چلا گیا، تو اسے ایک قوم ملی۔ جس نے خیال کیا کہ دنیا کے تمام بادشاہوں کی طرح ذوالقرنین بھی ظلم و تشدد کرے گا۔ لیکن ذوالقرنین نے اعلان کیا کہ بے گناہوں کے لیے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ جو لوگ نیک عملی کی راہ چلیں گے۔ ان کے لیے ویسا ہی اجر بھی ہو گا۔ البتہ ڈرنا انہیں چاہیے جو جرم و بد عملی کا ارتکاب کرتے ہیں۔

سادساً، وہ خدا پرست اور راست باز انسان تھا اور آخرت کی زندگی پر یقین رکھتا تھا۔

سابعاً، وہ نفس پرست بادشاہوں کی طرح طامع اور حریص نہ تھا۔ جب ایک قوم نے کہا کہ یا جوں ج اور ما جوں ج ہم پر حملہ آور ہوتے ہیں، آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک سد (دیوار) تعمیر کر دیں۔ ہم آپ کو خراج دیں گے۔ تو اس نے کہا

"ما گنگن فیہ ربیٰ خیر"

یعنی، جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے وہی میرے لئے بہتر ہے۔ میں تمہارے خراج کا طامع نہیں۔ یعنی میں خراج کی طمع سے کام نہیں کروں گا بلکہ اپنا فرض سمجھ کر یہ کام سرانجام دوں گا۔

تاریخ قدیم کی جس شخصیت میں یہ تمام اوصاف و اعمال پائے جائیں وہی ذوالقرنین ہو سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کون شخص تھا؟ سب سے پہلا حل طلب مسئلہ جو مفسرین کے سامنے آیا وہ اس کے لقب کا تھا، عربی میں بھی اور عبرانی میں بھی "قرن" کے صاف معنی "سینگ" کے ہیں۔ پس ذوالقرنین کا مطلب ہوا، "دو سینگوں والا"۔ لیکن چوں کہ تاریخ میں کسی ایسے بادشاہ کا سراغ نہیں ملتا جس کا ایسا لقب رہا ہو۔ اس لیے مجبوراً "قرن" کے معنوں میں طرح طرح کے تکلفات کرنا پڑے۔ پھر چوں کہ فتوحات کی وسعت اور مغرب و مشرق کی حکمرانی کے لحاظ سے سکندر مقدونی کی شخصیت سب سے زیادہ مشہور رہی ہے۔ اس لئے متاخرین کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ چنانچہ امام رازی نے سکندر رہی کو ذوالقرنین قرار دیا ہے۔ اور اگرچہ حسب عادت وہ نہام اعتراضات نقل کر دیے ہیں جو اس تفسیر پر وارد ہوتے ہیں۔ لیکن پھر حسب عادت ان کے بے محل جوابات پر مطمئن بھی ہو گئے ہیں۔ حالانکہ کسی اعتبار سے بھی قرآن کا ذوالقرنین، سکندر مقدونی نہیں ہو سکتا۔ نہ تو اسکندر مقدونی خدا پرست تھا، نہ عادل تھا، نہ مفتوح قوموں کے لیے فیاض تھا اور نہ اس نے کوئی سد (دیوار) ہی بنائی۔ بہر حال، مفسرین ذوالقرنین کی شخصیت کا سراغ نہ لگ سکے۔ جاری ہے۔

بنی اسرائیل کے نبی حضرت دانیال علیہ السلام کا خواب اگر ذوالقرنین کے مفہوم کا کوئی سراغ ملتا تھا، تو وہ صرف ایک دُور کا اشارہ تھا۔ جو حضرت دانیال علیہ السلام کی کتاب میں ملتا ہے۔ یعنی ایک خواب انہوں نے بابل کی اسیری کے زمانہ میں دیکھا تھا۔

بابل کی اسیری کا زمانہ یہودیوں کے لیے نہایت مایوسی کا زمانہ تھا۔ ان کی قومیت پامال ہو چکی تھی۔ ان کا ہیکل منہدم ہو چکا تھا۔ ان کے شہر اجڑتھے اور وہ نہیں جانتے تھے کہ اس ہلاکت کے بعد ان کی زندگی کا کیا سامان ہو سکتا ہے۔ اس زمانہ میں حضرت دانیال کا ظہور ہوا۔ جو اپنے علم و حکمت کی وجہ سے شاہ بابل کے دربار میں نہایت مقرب ہو گئے تھے۔ انہیں کی نسبت تورات میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ "بیلش فار" نامی شاہ بابل کی سلطنت کے تیسرا برس انہوں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ اور اس خواب میں آنے والے واقعات کی بشارت دی گئی تھی۔ چنانچہ کتاب دانیال میں ہے۔ "میں کیا دیکھتا ہوں کہ ندی کے کنارے ایک مینڈھا کھڑا ہے۔ جس کے دو سینگ اوچھے تھے۔ لیکن ایک دوسرے سے بڑا تھا۔ اور بڑا دوسرے کے پیچے تھا۔ میں نے دیکھا کہ پچھم (مغرب) اترا اور دکن (جنوب) کی طرف وہ سینگ مارتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی جانور اس کے سامنے کھڑا نہ رہ سکا۔ اور وہ بہت بڑا ہو گیا۔ میں یہ بات سوچ ہی رہا تھا کہ دیکھا پچھم کی طرف سے ایک بکرا آکے تمام روئے زمین پر پھر گیا۔ اس بکرے کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایک عجیب طرح کا سینگ تھا۔ وہ دو سینگ والے مینڈھے کے پاس آیا اور اس پر غضب سے بھڑکا۔ اور اس کے دونوں سینگ توڑا لے اور مینڈھے کو قوت نہ تھی کہ اس کا مقابلہ کرے۔"

پھر اس کے بعد ہے کہ جبریل نمایاں ہوا اور اس نے اس خواب کی یہ تعبیر بتائی کہ دو سینگوں والا مینڈھامیڈیا (شمال مشرقی ایران اور آزر بائیجان کی ایک قدیم سلطنت) اور فارس کی بادشاہت ہے۔ اور ایک سینگ والا بکر ایونان کی بادشاہت۔ جو بڑا سینگ اس کی آنکھوں کے درمیان دکھائی دیا ہے۔ وہ اس کا پہلا بادشاہ ہو گا۔ اس بیان سے معلوم ہوا کہ مادہ (میدیا) اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دی گئی تھی۔ اور چونکہ یہ دونوں مملکتیں مل کر مستقبل میں ایک شہنشاہی بننے والی تھی۔ اس لئے شہنشاہ مادہ و فارس کو دو سینگوں اور مینڈھے کی شکل میں ظاہر کیا گیا۔ پھر اس مینڈھے کو جس نے شکست دی وہ یونان کے بکرے کا پہلا سینگ تھا۔ یعنی سکندر مقدونی تھا۔ جس نے فارس پر حملہ کیا اور کیاںی شہنشاہی کا خاتمه ہو گیا۔ اس خواب میں بنی اسرائیل کے لیے بشارت یہ تھی کہ ان کی آزادی و خوش حالی کا نیا دور اسی دو سینگوں والی شہنشاہی کے ظہور سے وابستہ تھا۔ یعنی شہنشاہ فارس بالل پر حملہ کر کے فتح مند ہونے والا تھا۔ اور پھر اس کے ذریعہ بیت المقدس کی ازسرنو تعمیر اور یہودی قومیت کی دوبارہ شیر ازہ بندی ہونے والی تھی۔ چنانچہ برسوں کے بعد سائرس کا ظہور ہوا۔ اس نے میدیا اور پارس کی مملکتیں ملا کر ایک عظیم الشان شہنشاہی قائم کر دی۔ اور پھر بابل پر پے در پے حملے کر کے اسے مسخر کر لیا۔

چونکہ اس خواب میں میدیا اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دی گئی تھی۔ اس لئے خیال ہوتا تھا کہ عجب نہیں فارس کے شہنشاہ کے لیے یہودیوں میں ذو القرینین کا تصور پیدا ہو گیا ہو۔ یعنی دو سینگوں والی شہنشاہی اور وہ اسے اس لقب سے پکارتے ہوں۔ تاہم یہ محض ایک قیاس تھا اس کی تائید میں کوئی تاریخی شہادت موجود نہ تھی۔ لیکن ۱۸۳۸ء کے ایک اکشاف نے، جس کے نتائج بہت عرصہ کے بعد منظر عام پر آئے، اس قیاس کو ایک تاریخی حقیقت ثابت کر دیا۔ اور معلوم ہو گیا کہ فی الحقيقة شہنشاہ سائرس کا لقب ذو القرینین تھا۔ اور یہ سب محض یہودیوں کا کوئی مذہبی تخلیل نہ تھا۔ بلکہ خود سائرس کا باشند گان فارس کا مجوزہ اور پسندیدہ نام تھا۔ اس اکشاف نے شک و تجھیں کے تمام پر دے اٹھادے۔ یہ خود سائرس کا ایک سنگی تمثال ہے جو استخر (Pasargadoe) کے کھنڈروں میں دستیاب ہوا۔ اس میں سائرس کا جسم اس طرح دکھایا گیا ہے کہ اس کے دونوں طرف عقاب کی طرح پر نکلے ہوئے ہیں اور سر پر مینڈھے کی طرح دو سینگ ہیں۔ اور خڑ مخفی میں جو کتبہ کندہ تھا اس کا بڑا حصہ ٹوٹ کر ضائع ہو چکا ہے۔ مگر جس قدر باقی ہے وہ اس کے لیے کافی ہے کہ تمثال کی شخصیت واضح ہو جائے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ میدیا اور فارس کی مملکتوں کو دو سینگوں سے تشبیہ دینے کا تخلیل ایک مقبول اور عام تخلیل تھا۔ اور یقیناً سائرس کو ذو القرینین کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ تمثال میں پر دوں کا ہونا اس کے ملکوئی صفات و فضائل کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ نہ صرف پارسیوں میں بلکہ تمام معاصر قوموں میں یہ اعتقاد عام طور پر پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ایک غیر معمولی نوعیت کا انسان ہے۔ دو سینگوں کا تخلیل ابتداء میں کیوں کر پیدا ہوا؟ کیا اس کی بنیاد حضرت دانیال علیہ السلام کا خواب تھا؟ یا بطور خود سائرس نے یا باشند گان پارس نے یہ تخلیل پیدا کیا؟

اس کا فیصلہ مشکل ہے۔ لیکن اگر تورات کی روایات تسلیم کر لی جائیں تو سائرس سے لے کر آرٹاڑر کیسز (ارتخشت) اول تک تمام شہنشاہان پارس، بنی اسرائیل کے انبیا کرام علیہم السلام سے عقیدت رکھتے تھے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس خواب سے ذو القرینین کا لقب پیدا ہو گیا ہو۔ بہر حال اب اس میں شک کی کوئی گناہ نہیں رہی کہ سائرس کو ذو القرینین سمجھا جاتا تھا۔ اور یقیناً عرب کے یہودی بھی اسے اسی لقب سے پکار کرتے تھے۔

اس حقیقت کی وضاحت کے بعد جب سائرس کے ان حالات پر نظر ڈالی جاتی ہے جو یونانی مورخوں کی زبانی ہم تک پہنچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے بیان کی ہو بہو تصویر ہے۔ اور دونوں بیان اس درجہ باہم مطابقت رکھتے ہیں کہ ممکن نہیں کسی دوسری شخصیت کا وہم و گمان بھی کیا جا سکے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ شاہان فارس کے ناموں نے مختلف زبانوں میں مختلف صورتیں اختیار کر لی ہیں۔ اور اس کی وجہ سے مورخوں نے سخت غلطیاں کی ہیں۔ سائرس کا اصلی نام غامبیا گور، یا گوروش تھا۔ جیسا کہ دارا کے کتبہ بے ستون سے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یونانی اسے سائرس Cyrus کہنے لگے تھے۔ اور یہودیوں نے اس کا تلفظ خورس کی شکل میں کیا۔ چنانچہ یسیار، ارمیا اور دانیال کے صحائف میں جا بجا یہ نام آیا ہے۔ اور یہی گورش ہے۔ جس نے عربی میں خسرو کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ عرب مورخ اسے کیخسرو کے نام سے پکارتے ہیں۔

سائرس کا لڑکا کیم بی سیز Cambyses ہوا۔ یہ بھی یونانی تلفظ ہے۔ اس کا پارسی نام کیوچیہ تھا۔ جس نے یہودیوں اور عربوں کی زبان پر یہ کیقیاد کی شکل اختیار کی۔ شاہنامہ نے بھی اس کو اختیار کیا۔ کیوں کہ اس کی بنیاد عربی تراجم پر تھی۔ کیقیاد کے بعد داریوش ہوا۔ جسے عام طور پر دارا کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اور تورات میں بھی یہی نام آیا ہے۔ دارا کے بعد آرٹا زر کیسیز ہے۔ اسے تورات میں ارتھشت کے نام سے یاد کیا ہے۔ اور عربوں میں اس کا نام اردشیر مشہور ہو گیا۔

زمانہ حال کے محققین تاریخ نے فارس کی تاریخ کو تین زمانوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا عہد اسکندر کے حملے سے پہلے کا ہے۔ دوسرا پار تھوی یا ملوک الطوائف کا۔ تیسرا اساسی سلاطین کا۔

فارسی شہنشاہی کی عظمت کا اصلی عہد وہی ہے جو اسکندر کے حملے سے پہلے گزرا۔ اور جس کی تاریخ سائرس کے ظہور سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن بد قسمتی سے اس عہد کے حالات معلوم کرنے کے بر اہ راست ذرائع مفقود ہو گئے ہیں۔ جس قدر بھی حالات روشنی میں آئے ہیں، وہ تمام تر یونانی تحریروں سے ماخوذ ہیں۔ ان میں زیادہ اعتماد کے قابل تین مورخ ہیں۔

ہیرودوٹس Herodotus اور تیسیاز Ctesias اور زینوفون Xenophon

ایران کی فتح کے بعد جب عرب مورخین نے ایران کی تاریخ مرتب کرنا چاہی تو انہیں جس قدر مواد ہاتھ آیا وہ تمام تر پارسیوں کی قومی روایات پر مشتمل تھا۔ ان روایات میں اسکندر کے حملے سے پہلے کا زمانہ اسی طرح کے قومی افسانوں کی نوعیت رکھتا ہے، جس طرح ہندوستان میں پرانوں کے افسانے یا مہابھارت اور راماائن کے قصے ہیں۔ البتہ پچھلے دو عہدوں کی روایتیں تاریخی بنیادوں پر مبنی تھیں۔ جب دیقی اور فردوسی نے شاہنامہ کو نظم کرنا چاہا تو انہیں عربی میں بھی مواد ملا اور اسی کو انہوں نے نظم کا جامہ پہننا دیا۔ پس یہ تمام ذخیرہ قبل از اسکندر عہد کے لیے کچھ سودمند نہیں ہے۔ اور سائرس کے حالات کے لیے ہمیں تمام تر یونانی مورخین کی شہادت ہی پر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پانچ سو سالہ برس پہلے ایران کی سر زمین دو مملکتوں میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جنوبی حصہ پارس کاہلا تاختا اور شمالی مغربی حصہ میدیا چونکہ ان کے ہمسایہ میں آشوری اور بابلی حکومتیں انتہائی عروج تک پہنچ چکی تھیں۔ اس لئے قدرتی طور پر یہ، ان سے دبی ہوئی تھیں۔ دونوں مملکتوں میں مختلف قبائل کے امرات تھے۔ جو اپنے اپنے حلقوں میں قبائلی حکومت رکھتے تھے۔

612 قبل مسیح میں، جب نینوا تباہ ہو گیا اور آشوری فرمان روائی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی تو میدیا کے باشندے آزاد ہو گئے۔ اور بتدریج ایک قومی حکومت نشو و نما پانے لگی۔ اسی طرح پارس کے امراء قبائل میں سے بھی بعض امیروں کو سراٹھانے کا موقع ملا۔ اور حکمران خاندان پیدا ہو گیا۔ تاہم یہ دونوں مملکتیں وقت کی بے اثر حکومتیں تھیں اور بابل کی شہنشاہی جسے بخت نصر کی تہارانہ فتح مندیوں نے تمام ایشیاء میں سر بلند کر دیا تھا۔ سب پر چھائی ہوئی اور سب کو مقہور کئے ہوئے تھی۔

دارا کے کتبہ بے ستون میں اس میدیا کا نام "مادا" آیا ہے۔ اس لئے میدیا کو اس کا نویاں تلفظ سمجھنا چاہیے۔ عرب مورخوں نے اسے "ماہات" سے تعبیر کیا ہے۔

جاری ہے۔

559 قبل از مسیح میں ایک غیر معمولی شخصیت غیر معمولی حالات کے اندر ابھری اور اچانک تمام دنیا کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ یہ پارس کے ایکی می نیز خاندان کا ایک نوجوان گورش تھا۔ جسے یونانیوں نے سائرس، عبرانیوں نے خورس اور عربوں نے کیخسر و کے نام سے پکارا۔ اسے پہلے پارس کے تمام امیروں نے اپنا فرمانروایتی کر لیا۔ پھر بغیر کسی خوزنیزی کے میدیا کی مملکت پر فرمانروایہ گیا۔ اور اس طرح دونوں مملکتوں نے مل کر ایران کی ایک عظیم الشان شہنشاہی کی صورت اختیار کر لی۔

(دارانے بے ستون کے کتبہ میں اپنا سلسلہ ہنخانش نامی بادشاہ سے ملایا ہے۔ یہی ہنخانش یونانی میں Achaemenes ہو گیا۔ ہیرودوٹس کی روایت کے مطابق یہ سائرس کا پڑداد ا تھا۔ یعنی ایکے منی نیز سے چائش پیش پیدا ہوا۔ اس سے کم بی سیز (کمبوچیہ، یا یقیاد) اول اور کم بی سیز سے سائرس نے اپنے بڑے بڑے کے کا نام بھی کم بی سیز رکھا تھا۔)

پھر اس سائرس (گورش، خورس، کیخسر) کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ فتوحات نہیں جو ظلم و قهر کی خون ریزیوں کے ذریعہ حاصل کی جاتی تھیں۔ بلکہ انسانیت و عدالت کی فتوحات جو تمام تراس لئے تھیں کہ مظلوموں کی دادرسی اور پامال ملکوں کی دستگیری ہو۔ چنانچہ ابھی بارہ سال کی مدت بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ بحر اسود سے لے کر بکڑیا (بلخ) تک ایشیاء کی تمام عظیم الشان مملکتیں اس کے آگے سر بہ سبود ہو چکی تھیں۔

دنیا کی تمام غیر معمولی شخصیتوں کی طرح سائرس کے ابتدائی حالات نے بھی ایک پراسرار افسانہ کی نوعیت اختیار کر لی ہے اور ہمیں اس کی جھلک شاہ نامہ کے افسانوں میں صاف صاف نظر آ جاتی ہے۔ اس کا اٹھان زندگی کے عام اور معمولی حالات میں نہیں ہوا بلکہ ایسے عجیب حالات میں جو ہمیشہ پیش نہیں آتے اور جب کبھی پیش آتے ہیں تو یہ قدرت کی ایک غیر معمولی کرشمہ سنجی ہوتی ہے۔ قبل اس کے، کہ وہ پیدا ہو، اس کے نانا اسٹیگس Astyages

نے اس کی موت کا سامان کر دیا تھا۔ لیکن اسے ایک حیرت انگیز طریقے سے بچایا گیا۔ اور اس کی ابتدائی زندگی جنگوں اور پہاڑوں میں بسر ہوئی تھی۔ پھر ایک ایسا وقت بھی آگیا کہ اس کی غیر معمولی قابلیتیں اور اعلیٰ اخلاق و خصائص نے اسے ملک میں نمایاں کر دیا اور اس کی خاندانی شخصیت و شناخت پہچان لی گئی۔ اب اسے پورا موقع حاصل تھا کہ اپنے دشمنوں سے انتقام لے۔ لیکن اسے ایک لمحہ کے لیے بھی اس کا خیال نہیں گزرا۔ حتیٰ کہ خود اسٹیاکس کی زندگی بھی اس کے ہاتھوں میں محفوظ رہی۔

تحت نشینی کے بعد سب سے پہلی جنگ جو اسے پیش آئی وہ لیدریا (Lydia) کے بادشاہ کروسیس (Croesus) سے تھی۔ لیکن تمام مورخین متفق ہیں کہ حملہ کروسیس کی طرف سے ہوا تھا۔ اور اس نے سائرس کو دفاع پر مجبور کر دیا تھا۔ لیڈریا سے مقصود ایشیائے کوچک (Asia Minor) کا مغربی و شمالی حصہ ہے جو یونانی تمدن کا ایشیائی مرکز بن گیا تھا۔ اور اس کی حکومت بھی اپنے تمام خصائص میں ایک یونانی حکومت تھی۔ جنگ میں سائرس فتح یا ب ہوا لیکن رعایا کے ساتھ کسی طرح کی بد سلوکی نہیں کی گئی۔ انہیں محسوس بھی نہیں ہوا کہ ملک ایک انقلاب یا جنگ کی حالت سے گزر رہا ہے۔ البتہ کرونس کی نسبت یونانی روایت یہ ہے کہ اس کے عزم و ہمت کی آزمائش کے لیے سائرس نے حکم دیا تھا کہ ایک چتلتار کی جائے اور اسے جلا دیا جائے۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ مردانہ وار چتا پر بیٹھ گیا ہے تو فوراً اس کی جان بخشنی کر دی۔ اور اس نے بقیہ زندگی عزت احترام کے ساتھ برس کی۔ اس جنگ کے بعد اسے مشرق کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ کیونکہ گیدروسیا (مکران) اور بکریا (بغیر) کے وحشی قبائل نے سرکشی کی تھی۔

یہ مہم ۵۳۰ اور ۵۲۵ قبل مسیح کی در میانی مدت میں واقع ہوئی ہو گی۔ تقریباً یہی زمانہ ہے جب باشندگان بابل نے اس سے درخواست کی تھی کہ بیل شازار (Belshazzar) کے مظالم سے انہیں نجات دلائے۔ نینو اکی تباہی نے ایک نئی بابلی شہنشاہی کی بنیادیں استوار کر دی تھیں اور بنو کد نزار (بحث نصر) کی قاہر انہ فتوحات نے تمام مغربی ایشیاء کو مسخر کر لیا تھا۔ اس کا حملہ بیت المقدس تاریخ کا ایک انقلاب انگیز واقعہ ہے۔ وہ صرف بادشاہوں کو مسخر ہی نہیں کرتا تھا بلکہ قوموں کو غلام بنتا اور ملکوں کو تباہ کر ڈالتا تھا۔ لیکن اس کے مرنس کے بعد کوئی ایسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی جو اس کی جنگ جویانہ قوتوں کی جانشیں ہوتی۔ اس کے بعد بابل کے مندو روں کے چباریوں نے (جو ملک میں سب سے زیادہ اثر و مقبولیت رکھتے تھے) نابونیدس (Nabonidus) کو تحنت نشین کیا تھا۔ لیکن اس نے حکمت کا تمام کاروبار بیل شازار کے ہاتھ چھوڑ دیا جو ظلم و عیاشی کا مجسمہ تھا۔ اس کے بارے میں حضرت دنیال علیہ السلام کے صحیفہ میں ہم پڑھتے ہیں کہ بیت المقدس کے ہیکل کے مقدس پیالوں میں اس نے شراب پی تھی۔ اور ایک غیری ہاتھ نے نمایاں ہو کر "منے منے تقلیل و فر سین" کے الفاظ دیوار پر لکھ دیے تھے۔ (صحیفہ دنیال ۱:۵)

(اس نوشیہ دیوار کا مفہوم یہ ہے کہ تجھے کسوٹی پر پر کھا گیا، اور ٹونا قص لکلا، لہذا تجھ سے تحنت لے کر تیرے دشمنوں کو دے دیا جائے گا۔) جاری ہے۔

تمام مورخین متفق ہیں کہ اس عہد میں بابل سے زیادہ مستحکم اور ناقابل تفسیر کوئی شے نہ تھی۔ اس کی چار دیواری اتنی موٹی، تدرستہ اور اوپرچی تھی کہ اسے مسخر کرنے کا وہم و گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

بایں ہمہ سائرس نے باشندگان بابل کی فریاد پر لبیک کہا اور دو آبہ کا تمام علاقہ فتح کرتا ہوا شہر کے سامنے نمودار ہو گیا۔ چوں کہ خود باشندگان شہر بیل شازار کے مظالم سے تنگ آگئے تھے اور سائرس کے لیے چشم برہ تھے۔ اس لئے انہوں نے ہر طرح اس کا ساتھ دیا۔

خوب بالی حکومت کا ایک سابق گورنر گوب ریاس (Gobryas) اس کی فوج کے ساتھ تھا۔ ہیر و ڈوٹس کا بیان ہے کہ اس شخص نے دریا سے نہریں کاٹ کر اس کا بہاؤ دوسری طرف ڈال دیا۔ اور دریا کی جانب سے فوج شہر میں داخل ہو گئی۔ قبل اس کے کہ خود سائرس شہر میں پہنچے، شہر فتح ہو چکا تھا۔ تورات کی شہادت یہ ہے کہ سائرس کا ظہور اور بابل کی فتح بنی اسرائیل کے لیے زندگی و خوش حالی کا نیا پیام تھا اور یہ ٹھیک اسی طرح ظہور میں آئی جس طرح یسوعیہ نبی نے ایک سو ساٹھ برس پہلے اور یہ میاہ نے ساٹھ برس پہلے وہی الہی سے مطلع ہو کر خبر دے دی تھی۔ چنانچہ سائرس نے دنیا بُنی کی نہایت توقیر کی۔ یہودیوں کو یہودیم میں بننے کی اجازت دے دی۔ نیز اپنی تمام مملکت میں اعلان کیا کہ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ یہودیم میں اس کے لیے ایک ہیکل بناؤ (یعنی قدیم برباد شدہ ہیکل سیمانی کو از سر نو تعمیر کروں) پس تمام لوگوں کو ہر طرح کاساز و سامان اس کے لیے مہیا کرنا چاہیے۔ اس نے سونے چاندی کے وہ تمام ظروف جو بنو کد نزار (جنت نصر) ہیکل سے لوٹ کر لایا تھا۔ بابل کے خزانہ سے نکلوائے اور یہودیوں کے ایک امیر شیش بفر کے حوالے کر دیئے کہ ہیکل کی تعمیر کے بعد اس میں بدستور کھدیے جائیں۔ (عزرا۔ باب اول)

بابل کی فتح کے بعد سائرس کی عظمت تمام مغربی ایشیاء میں مسلم ہو گئی۔ ۵۳۹ ق م میں صرف اس کی تنہ شخصیت عظمت و حکمرانی کے عالمگیر تخت پر نمایاں نظر آتی ہے۔ بارہ برس پہلے وہ پارس کے پہاڑوں کا ایک گمنام انسان تھا۔ لیکن اب ان تمام مملکتوں کا تنہ افرمازوں بن چکا تھا جو صدیوں تک قوموں کی ابتدائی عظمتوں اور فتح مندوں کا مرکز رہ چکی تھیں۔ فتح بابل کے بعد وہ تقریباً سو برس تک زندہ رہا اور ۵۳۹ ق م میں مسیح میں انتقال کر گیا۔ اب قبل اس کے کہ قرآن کے بیان کردہ حالات پر نظر ڈالی جائے، اس بات پر غور کر لینا چاہیے کہ انبیاء بُنی اسرائیل کی پیشین گوئیاں اس شخصیت کے بارے میں کیا تھیں۔ اور یہودیوں کے اعتقاد میں کس طرح وہ حرف بہ حرف پوری ہوئیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی پیشین گوئی یسوعیہ نبی کی ہے جن کا ظہور سائرس کی فتح بابل سے ایک سو ساٹھ برس پہلے ہوا تھا۔ انہوں نے پہلے بیت المقدس کی تباہی کی خبر دی ہے کہ بابل کے ہاتھوں بیت المقدس کی تباہی ظہور میں آئے گی۔ اس کے بعد اس کی دوبارہ تعمیر کی بشارت دی ہے اور اس سلسلہ میں خورس (سائرس) کے ظہور کا ذکر کیا ہے۔

"خداؤند، یعنی تیر انجات دینے والا یوں فرماتا ہے کہ، یہودیم پھر آباد کیا جائے گا۔ یہودا کے شہر بنائے جائیں گے۔ میں اس کے ویران مکانوں کو تعمیر کروں گا۔ میں خورس کے حق میں کہتا ہوں کہ وہ میراچردا ہا ہے۔ وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا۔ خداوند اپنے مسیح خورس کے حق میں یوں فرماتا ہے کہ میں نے اس کا داہنا تھک کپڑا، تاکہ قوموں کو اس کے قابو میں کردوں اور بادشاہوں کی کمریں کھلاؤں۔ اور دہرے دروازے اس کے لیے کھول دوں۔ ہاں میں تیرے آگے چلوں گا۔ میں ٹیڑھی جگہوں کو سیدھا کروں گا۔ میں پیتل کے دروازوں کو ٹکڑے ٹکڑے کردوں گا میں گڑے ہوئے خزانے اور چھپے ہوئے مکانوں کے کنج تجھے عطا کر دوں گا۔ اور یہ سب کچھ اس لئے کروں گا تاکہ تو جان لے کہ میں خداوند اسرائیل کا خدا ہوں۔ جس نے اپنی برگزیدہ قوم اسرائیل کے لیے تجھے تیر انام صاف صاف لے کے بلایا۔" (یسوعیہ ۲۱: ۲۳)

اس پیشین گوئی میں خدا کا یہ فرمان نقل کیا گیا ہے کہ خورس (سائرس) میراچردا ہا ہو گا۔ اور میں نے اسے اس لیے پکارا ہے کہ نبی اسرائیل کو بابلیوں کے ظلم سے نجات دلائے۔ نیز اسے خدا کا مسیح بھی کہا ہے۔ اسی طرح یہ میاہ نبی نے ساٹھ برس پہلے پیشین گوئی کی تھی۔

"قوموں کے درمیان منادی کر دو۔ اور اسے مت چھپاؤ۔ تم کہو کہ بابل لے لیا گیا، بعل رسو اہوا، مردوک سراسیمہ کیا گیا۔ اس کے بہت خجل ہوئے۔ اس کی مور تیں پریشان کی گئیں۔ کیونکہ شمال سے ایک قوم اس پر چڑھتی ہوئی آرہی ہے۔ جو اس کی سرزی میں اجازہ دے گی۔ یہاں تک کہ اس میں کوئی نہیں رہے گا" (۵۰:۱)

(بعل اور مردوک بابلی قوم کے بڑے دیوتات تھے، جن کی وہاں عبادت کی جاتی تھی۔

جاری ہے

یر میاہ نبی نے اس بات کی بھی پیشین گوئی کر دی تھی کہ ستر بر س تک یہودی بابل میں قید رہیں گے۔ اور اس کے بعد بیت المقدس کی نئی تعمیر ہو گی۔ "خداوند فرماتا ہے کہ جب بابل پر ستر بر س گزر چلیں گے تو میں تمہاری خبر لینے آؤں گا۔ تب تم مجھے پکارو گے۔ اور میں جواب دوں گا۔ تم مجھے ڈھونڈو گے اور مجھے پالو گے۔ میں تمہاری اسیری ختم کر دوں گا۔ تمہیں تمہارے مکانوں میں واپس لے آؤں گا۔" (۲۹:۱)

اس پیشین گوئی میں خدا نے اپنی رحمت کی واپسی کو فتح بابل کے واقعہ سے وابستہ کر دیا ہے۔ گویا سائرس کا ظہور اس کی رحمت کا ظہور ہو گا۔ جو بنی اسرائیل پر بوٹ آئے گا۔

تورات سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جب سائرس نے بابل فتح کیا تو دنیا بھی نبی نے (جو شاہان بابل کے وزراء میں داخل ہوئے تھے)، اسے یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی دکھلائی کہ ایک سوساٹھ برس پہلے اس کے ظہور کی خبر دے دی گئی تھی۔ یہ بات دیکھ کر وہ بے حد متأثر ہوا۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس کا نتیجہ وہ فرمان تھا جو اس نے ہیکل سليمانی کی از سرِ نو تعمیر کے سلسلے میں جاری کیا تھا۔

زمانہ حال کے بعد نقاد ایسے ہیں کہ جو ان پیشین گوئیوں کی اصلاحیت پر مطمئن نہیں ہیں اور وہ کہتے ہیں، کہ ہو سکتا ہے کہ یہ پیشین گوئیاں واقعات کے ظہور کے بعد بڑھادی گئی ہوں۔ خصوصاً حضرت یسعیاہ نبی علیہ السلام کی پیشین گوئی جس میں صریح و واضح خورس (سائرس) کا نام موجود ہے۔ لیکن وہ اس اشتباہ کی تائید میں عقلی استغرا ب کے سوا اور کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتے۔ اور محض عقلی استغرا ب، ان صحائف کے خلاف جنت نہیں ہو سکتا، جن کی نسبت یہ یقین کیا گیا ہے کہ الہام سے لکھے گئے تھے۔

علاوہ برائی، تورات کے آخری صحائف جو فتح بیت المقدس کے اثناء میں یا اسیری بابل کے زمانہ میں لکھے گئے ہیں، سب کے سب تاریخی حیثیت سے محفوظ تسلیم کرنے لگئے ہیں کیوں کہ وہ اس وقت سے برابر یہودیوں میں منتداول رہے۔ اور کوئی حادثہ ایسا رونما نہیں ہوا کہ اگلے نئے نابود ہو گئے ہوں۔ ہاں البتہ یہ ضرور ممکن ہے کہ یسعیاہ نبی علیہ السلام کی پیشین گوئی میں بھی دنیا بھی علیہ السلام کے خواب کی طرح خورس کا نام نہ بتایا گیا ہو۔ صرف قومِ ولک کا ذکر ہوا اور بعد کو یہ نام بڑھادیا گیا ہو۔

لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہودیوں کا عام اعتقاد برابر یہی رہا کہ سائرس کا ظہور نہیں کی پیشین گوئی کے عین مطابق ہوا تھا۔ اور وہ خدا کی ایک پسندیدہ ہستی تھی۔ جو اس لئے پیدا کی گئی تھی کہ مظلوموں کی دادرسی ہو اور بابلیوں کے ظلم و شرارت سے قوموں کو نجات ملے۔

بنی اسرائیل کی روایات یعنی اسرائیلیات، عہد نامہ عقیق و عہد نامہ جدید میں موجود شواہد، تاریخ گوئی گواہی اور خود مکمل آثار قدیمہ کی جانب سے دیے گئے دلائل، یہ سب تو ہمارے پاس یہاں جمع ہو گئے۔

اب اگر ہم غور کرتے ہیں تو واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی تصریحات نے جو جامہ تیار کیا ہے وہ کس طرح ٹھیک ٹھیک صرف سائز (یعنی خورس) ہی کے جسم پر راست آتا ہے۔

سب سے پہلے اس بات پر غور فرمائیے کہ ذوالقرنین کی نسبت یہ سوال نبی آخر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بالاتفاق یہودیوں کی جانب سے پوچھا گیا تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر کسی غیر یہودی بادشاہ کی شخصیت یہودیوں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھی جاسکتی تھی تو وہ صرف سائز ہی کی تھی۔

نبیوں کی پیشین گوئیوں کا مصدق، دنیا میں نبی کے خواب کا ظہور، رحمت الہی کی واپسی کی بشارت، نبی اسرائیل کا نجات دہنده، خدا کا ایک فرستادہ، چرواحا اور مسیح، یروشلم کی تعمیر ثانی کا وسیلہ، پس اس سے زیادہ قدرتی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس ہی کی نسبت ان کا سوال ہو؟ (جاری ہے۔)

علامہ آلوسی کی تفسیر میں بیان کردی ایک روایت میں بھی (جو قرطبی وغیرہ نے نقل کی ہے) اس طرف صریح اشارہ ملتا ہے۔

قال قالت اليهود: "أَخْبَرَنَا عَنْ نَبِيٍّ لَمْ يُذْكُرْ إِلَّا فِي التُّورَاتِ الْأَفِيِّ مَكَانٌ وَاحِدٌ" قال: "وَمَنْ؟" قالوا "ذُوالْقَرْنَيْنِ۔"

یعنی یہودیوں نے آنحضرت سے کہا: "اس کی نسبت ہمیں خبر دی جیسے، جس کا تذکرہ تورات میں صرف ایک بار اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔" آپ ﷺ نے فرمایا، "وہ کون؟" انہوں نے کہا: "ذوالقرنین۔"

چوں کہ سائز کے ذوالقرنین ہونے کا اشارہ صرف دنیا میں نبی کے خواب ہی میں آیا ہے۔ اس لئے یہودیوں کا یہ بیان ٹھیک اسی طرف اشارہ تھا۔ علاوہ بر ایں، سائز کے تمثیل کے اکٹھاف نے قطعی طور پر یہ بات آشکار کردی ہے کہ اس کے سر پر دو سینگوں کا تاج رکھا گیا تھا اور یہ فارس اور مادہ (میڈیا) کی مملکتوں کے اجتماع و اتحاد کی علامت تھی۔

اس کے بعد قرآن کی تصریحات سامنے لائی جائیں تو سب سے پہلا صفحہ جو اس کا بیان کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ "إِنَّمَا نَلَهُ فِي الْأَرْضِ مَا تَرَى مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَباً" (سورۃ کہف: آیہ 84)

"ہم نے اسے زمین میں قدرت دی تھی۔ اور ہر طرح کا ساز و سامان مہیا کر دیا تھا۔"

قرآن جب کبھی انسان کی کامرانی و خوشحالی کو بر اہ راست خدا کی طرف منسوب کر کے کہتا ہے، جیسا کہ یہاں آیا ہے، تو اس سے مقصود عموماً کوئی ایسی بات ہوتی ہے جو عام حالات کے خلاف محض اس کے فضل و کرم سے ظہور میں آئی ہو۔ مثلاً حضرت یوسفؑ کی نسبت فرمایا: "كَذَكَ مَكْنَى يُوسُفُ فِي الْأَرْضِ"

(سورۃ یوسف: آیہ 56)

"اس طرح ہم نے سر زمین میں یوسفؑ کو حکومت دے دی۔"

"ہم نے دے دی" کیوں کہ یہ ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ کو ہر طرح کے ناموفق حالات میں محض فضل الہی سے ایک غیر معمولی بات حاصل ہو گئی تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ عام حالات کے مطابق ظہور میں آئی ہو۔ پس ضروری ہے کہ ذوالقرنین کو بھی حکمرانی کا مقام ایسے ہی حالات میں ملا ہو جو بالکل

غیر معمولی قسم کے ہوں۔ اور انہیں محض توفیق الہی کی کرشمہ سازی سمجھا جاسکے۔ کیوں کہ اس کے تمکن فی الارض کو براہ راست خدا کی طرف نسبت دی گئی ہے۔

لیکن اس اعتبار سے سائرس کی زندگی ٹھیک ٹھیک اس آیت کی تصویر ہے۔ اس کی ابتدائی زندگی ایسے حالات میں بسر ہوئی جنہیں حیرت الگیز حوادث نے ایک افسانہ کی شکل دے دی ہے۔ قبل اس کے کہ وہ پیدا ہو، خود اس کا نانا اس کی موت کا خواہش مند ہو گیا تھا۔ ایک وفادار آدمی نے اس کی زندگی بچائی۔ اور وہ شاہی خاندان سے بالکل الگ ہو کر ایک گنمام گذریے کی طرح پہاڑوں میں زندگی بسر کرتا رہا۔ پھر اچانک نمایاں ہو گیا اور بغیر کسی جنگ و مقام لہ کے میڈیا کا تخت اس کے لیے خالی ہو گیا۔

یقیناً یہ صورت حال و اقدامات و حوادث کی عام رفتار نہیں ہے جو ہمیشہ پیش آتی ہو۔ یہ نادر ہستی کی ایک غیر معمولی عجائب آفرینی ہے۔ اور صاف نظر آرہا ہے کہ قدرت کا مخفی ہاتھ کسی خاص مقصد سے ایک خاص ہستی تیار کر رہا ہے اور زمانہ کی عام رفتار تھم گئی ہے تاکہ اس کی راہ صاف ہو جائے۔ اس کے بعد اس کی تین بڑی مہموں کا ذکر آتا ہے۔ ایک مغرب الشمس کی طرف یعنی پچھم کی طرف، ایک مطلع الشمس کی طرف یعنی پورب کی طرف اور تیسرا ایک ایسے مقام تک جہاں کوئی وحشی قوم آباد تھی۔ اور یاجونج اور ما جونج وہاں آکر لوٹ مار چوایا کرتے تھے۔ اب دیکھیے کہ یہ تمام تفصیلات کس طرح ٹھیک ٹھیک سائرس کی فتوحات پر منطبق ہوتی ہیں۔

یاد رہے کہ پچھم اور پورب کے لیے مغرب الشمس اور مطلع الشمس کی تعبیر تورات میں بھی جا بجا آئی ہے۔ مثلاً ذکر یانبیؑ کی کتاب میں ہے۔

"رب الافق فرماتا ہے میں اپنے لوگوں کو سورج نکلنے کے ملک اور اس کے ڈوبنے کے ملک سے چھڑالوں گا۔"(۸:۷)

اوپر ہم پڑھ چکے ہیں کہ سائرس نے ابھی فارس اور میڈیا کا تاج سر پر کھاہی تھا کہ ایشیائے کو چک کے بادشاہ کروئیں نے حملہ کر دیا۔ ایشیائے کو چیک کی یہ بادشاہت جو لیڈیا کے نام سے مشہور ہوئی، سائرس سے پچھلی صدی کے اندر ابھری تھی۔ اس کا دارالحکومت سارڈیس (Sardis) تھا۔ سائرس کی تخت نشینی سے پہلے میڈیا اور لیڈیا میں کئی جنگیں ہو چکی تھیں۔

بالآخر کروئیں کے باپ نے سائرس کے نانا، استیاگس کے باپ سے صلح کر لی۔ اور باہمی اتحاد کے استحکام کے لیے باہمی ازدواج کا رشتہ بھی قائم ہو گیا۔ لیکن کروئیں نے یہ تمام عہد و پیام اور باہمی رشتے بھلا دیئے۔ وہ سائرس کی کامرانی برداشت نہ کر سکا کہ فارس اور میڈیا کی مملکتیں متحد ہو کر ایک عظیم مملکت کی حیثیت اختیار کر رہی ہیں۔ اس نے پہلے باہل مصر اور اسپارتا کی مملکتوں کو اس کے خلاف ابھارا اور پھر اچانک حملہ کر کے سرحدی شہر پٹیریا (Pteria) پر قبضہ کر لیا۔

اب سائرس مجبور ہو گیا کہ بلا توقف وہ اس حملہ کا مقابلہ کرے۔ وہ میڈیا کے دارالحکومت سے (جو اب ہمدان کے نام سے پکارا جاتا ہے) نکلا اور اس تیزی کے ساتھ بڑھا کہ صرف دو جنگوں کے بعد پٹیریا اور سارڈیس سمیت لیڈیا کی تمام مملکت پر قابض ہو گیا۔

ہیر و ڈوئس نے اس جنگ کی سرگزشت پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہے۔ اور اس کی بعض تفصیلات نہایت دلچسپ اور اہم ہیں، لیکن یہ موضوع ہمارا نہیں۔ وہ کہتا ہے۔ سائرس کی فتح مندی ایسی عجیب اور مجرمانہ تھی کہ پٹیریا کے معز کوں کے بعد صرف چودہ دن کے اندر لیڈیا کا مسکتم دارالحکومت مسخر ہو گیا اور کروئیں ایک جنگی قیدی کی حیثیت سے سائرس کے آگے سرگوں کھڑا تھا۔

اب تمام ایشیائے کوچک، بھر شام سے لے کر کراسود تک اس کے زیر نگیں تھے۔ وہ برابر بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ مغربی ساحل تک پہنچ گیا۔ قدرتی طور پر اس کے قدم یہاں پہنچ کر اس طرح رک گئے جس طرح بارہ سو سال پہلے طارق کے قدم افریقہ کے شمالی ساحل پر رک جانے والے تھے۔ اس کے فتح مند قدموں کے لیے صحراؤں کی وسعتیں اور پہاڑوں کی بلندیاں رکاوٹ نہ ہو سکیں۔ اس نے فارس سے لے کر لیڈیا تک چودہ سو میل کا فاصلہ طے کر لیا تھا۔ لیکن سمندر کی موجودی پر چلنے کے لیے اس کے پاس کوئی سواری نہ تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو حد نظر تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا تھا اور سورج اس کی لہروں میں ڈوب رہا تھا۔ یہ لشکر کشی جو اسے پیش آئی، صریحًا مغرب کی لشکر کشی تھی کیوں کہ وہ ایران سے مغرب کی طرف چلا اور لیڈیا کے مغربی کنارے تک پہنچ گیا۔ یہ اس کے لیے مغربِ الشس کی آخری حد تھی۔

ایشیائے کوچک کا مغربی ساحل نقشہ میں نکالیے۔ آپ دیکھیں گے کہ تمام ساحل اس طرح کا واقعہ ہوا ہے کہ چھوٹے چھوٹے خلچ پیدا ہو گئے ہیں اور سمنا کے قریب اس طرح کے جزیرے نکل آئے ہیں جنہوں نے ساحل کو ایک جھیل یا حوض کی کی شکل دے دی ہے۔ لیڈیا کا دارالحکومت سارڈین مغربی ساحل کے قریب تھا۔ اور اس کا محل موجودہ سمنا سے بہت فاصلہ پر نہ تھا۔ پس جب سارے سارڈین کی تسخیر کے بعد آگے بڑھا ہو گا تو یقیناً بھر اجھیں کے اس ساحلی مقام پر پہنچا ہو گا جو سمنا کے قرب و جوار میں واقع ہے۔ یہاں اس نے دیکھا ہو گا کہ سمندر نے ایک جھیل کی سی شکل اختیار کر لی ہے۔ ساحل کی کچھ سے پانی گدلا ہو رہا ہے۔ اور شام کے وقت اس میں سورج ڈوبتا دکھائی دیتا ہے۔ اس صورت حال کو قرآن نے ان لفظوں میں بیان کیا۔

وَجْدُهَا تَغْرِبُ فِي عَيْنِ حَمِيمٍ۔ (۸۲)

"اسے ایسا دکھائی دیا کہ سورج ایک گدے حوض میں ڈوب رہا ہے۔"

یہ ظاہر ہے کہ سورج کسی مقام میں بھی ڈوبتا نہیں لیکن ہم سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر دیکھتے ہیں تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ایک سنہری تھالی آہستہ آہستہ سمندر میں ڈوب رہی ہے۔

دوسری لشکر کشی مشرق کی طرف تھی۔ چنانچہ ہیر و ڈوٹس اور ٹی سیاڑ دنوں اس کی مشرقی لشکر کشی کا ذکر کرتے ہیں۔ جو لیڈیا کی فتح کے بعد اور بابل کی فتح سے پہلے پیش آئی تھی۔ اور دنوں نے تصریح کی ہے کہ "مشرق کے بعض و حصی اور صحرائیں قبائل کی سر کشی اس کا باعث ہوئی تھی۔ یہ ٹھیک ٹھیک قرآن کے اس ارشاد کی تصدیق ہے کہ

حَتَّى إِذَا لَبَغَ مَطْلَعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعَ عَلَى قَوْمٍ تَجْعَلُ لَهُمْ مِنْ دُونِ خَاسِرٍ (۹۰)

"جب وہ مشرق کی طرف پہنچا تو اسے ایسی قوم ملی جو سورج کے لیے کوئی آڑ نہیں رکھتی تھی۔"

یعنی یہ خانہ بدوش قبائل تھے۔ اب یہ خانہ بدوش قبائل کون تھے؟ ان مورخین کی صراحت کے مطابق بکڑیا یعنی بلخ کے علاقہ کے قبائل تھے۔ نقشہ پر اگر نظر ڈالی جائے تو صاف نظر آجائے گا کہ بلخ ٹھیک ٹھیک ایران کے لیے مشرق اقصیٰ کا حکم رکھتا ہے۔ کیوں کہ اس کے آگے پہاڑ ہیں اور انہوں نے راہ روک دی ہے۔ اس کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ گیڈرو سیا کے و حصی قبیلوں نے اس کی مشرقی سرحد میں بدامنی پھیلائی تھی۔ اور ان کی گو شامی کے لیے اسے

نکناپڑا۔ گیڈروسیا سے مقصود ہی علاقہ ہے جو آج کل مکران کہلاتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہندوستان کی طرف ہمیں کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ اس لئے قیاس کہتا ہے کہ مکران سے نیچے اس کے قدم نہیں اترے ہوں گے۔ اور اگر اترے ہوں گے تو دریائے سندھ سے آگے نہیں بڑھے ہوں گے کیوں کہ دارا کے زمانے میں بھی اس کی جنوب مشرقی سرحد دریائے سندھ ہی تک معلوم ہوتی ہے۔

(ٹیسیاز Ctesias) ایک یونانی تھا جو 398 قبل مسیح سے لے کر 414 قبل مسیح تک شہنشاہان پارس کا دربار طبیب رہا اور اس زمانے کے کچھ عرصہ بعد اس نے اپنی مشہور خلکھلی۔ بعد کے یونانی مورخوں نے اس کے بعض بیانات شک کی تھے اس سے دیکھے ہیں۔ اور اس لئے اسے استناد کا وہ درجہ حاصل نہ ہو سکا جو ہیرودوٹس (المتولد ۸۲ قم) کی تاریخ کو حاصل ہوا ہے۔ مگر موجودہ زمانے کے محققین تاریخ کا ایسا خیال نہیں ہے۔)

تیری لشکر کشی اس نے ایسے علاقہ تک کی جہاں یا جوں ماجون کے حملے ہو اکرتے تھے۔ یہ یقیناً اس کی شمالی مہم تھی جس میں وہ بحر خزر (کیسپین سی) کو داہنی طرف چھوڑتا ہوا کوہ قاف (Caucasus) کے سلسلہ کوہ تک پہنچ گیا تھا۔ اور وہاں اسے ایک درہ ملا تھا جو دو پہاڑی دیواروں کے درمیان تھا۔ اس راہ سے یا جوں ماجون آکر اس طرف کے علاقے میں تاخت و تاریخ کیا کرتے تھے۔ اور یہیں اس نے سد (دیوار) تعمیر کی۔

قرآن نے اس مہم کا حال ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

حتیٰ اذابغین السدین وجد من دو نخما قوما لایکا دون یفقطون قول (۹۳)

"یہاں تک کہ وہ دو پہاڑی دیواروں کے درمیان پہنچ گیا۔ ان کے اس طرف اسے ایک قوم ملی جو کوئی بات بھی سمجھ نہیں سکتی تھی۔"

پس صاف معلوم ہوتا ہے کہ "سدین" سے مقصود کیشیا کا پہاڑی درہ ہے کیوں کہ اس کے داہنی طرف بحر خزر ہے۔ جس نے شمال اور مشرق کی راہ روک دی ہے۔ باسیں جانب بحر اسود سے جو شمال مغرب کے لیے قدرتی روک ہے۔ درمیانی علاقے میں اس کا سر بغلک سلسلہ کوہ ایک قدرتی دیوار کا کام دے رہا ہے۔ پس اگر شمالی قبائل کے حملوں کے لیے کوئی راہ باقی رہی تھی تو وہ صرف اس سلسلہ کوہ کا ایک عریض درہ یا وسطی وادی تھی۔ اور یقیناً وہیں سے یا جوں ماجون کو دوسری طرف پہنچنے کا موقعہ ملتا تھا۔ اس راہ کے بند ہو جانے کے بعد نہ صرف بحر خزر سے لے کر بحر اسود تک کا علاقہ محفوظ ہو گیا۔ بلکہ سمندروں اور پہاڑوں کی ایک ایسی دیوار قائم ہو گئی جس نے تمام مغربی ایشیا کو اپنی پاسبانی میں لے لیا۔ اور شمال کی طرف سے حملے کا کوئی خطرہ باقی نہ رہا۔ اب ایران شام، عراق، عرب ایشیائے کوچک بلکہ مصر بھی شمال کی طرف سے بالکل محفوظ ہو گیا تھا۔ نقشہ میں یہ مقام دیکھیں تو تمام مغربی ایشیا پہنچے ہے۔ اور شمال میں بحر خزر ہے۔ اس سے باسیں جانب شمال مغرب میں بحر اسود ہے۔ درمیان میں بحر خزر کے مغربی ساحل سے بحر اسود کے مشرقی ساحل تک کا کیشیا کا سلسلہ کوہ چلا گیا ہے۔ ان سمندروں اور درمیان کے سلسلہ کوہ نے مل کر سینکڑوں میلوں تک ایک قدرتی روک پیدا کر دی ہے۔ اب اس روک میں اگر کوئی شکاف رہ گیا تھا۔ جہاں سے شمالی اقوام کے قدم اس رکاوٹ کو پھلانگ سکتے تھے تو صرف یہی دو پہاڑوں کے درمیان کی راہ تھی۔

ذوالقرنین نے اسے بھی بند کر دیا۔ اور اس طرح شمال اور مغربی ایشیا کا یہ درمیانی پھانٹ پوری طرح مغلل ہو گیا۔

باقی رہائیہ سوال کہ وہاں جو قوم ذوالقرنین کو ملی تھی۔ اور جو بالکل ناسمجھ تھی۔ وہ کون سی قوم تھی؟ تو اس سلسلے میں دو قومیں نمایاں ہوتی ہیں۔ اور دونوں کا اس زمانہ میں وہاں قریب قریب آباد ہونا تاریخ کی روشنی میں آچکا ہے۔ پہلی قوم وہ ہے جو بحر خزر کے مشرقی ساحل پر آباد تھی۔ اسے یونانی مورخوں نے کیسپین کے نام سے پکارا ہے۔ اور اسی کے نام سے بحر خزر کا نام کیسپین پڑ گیا۔ دوسری قوم وہ ہے جو اس مقام سے آگے بڑھ کر عین کا کیشیا کے دامن

میں آباد تھی۔ یونانیوں نے اسے کول شی کے نام سے پکارا ہے۔ اور دارا کے کتبہ میں اس کا نام کوشیہ آیا ہے۔ ان ہی دو قوموں میں سے کسی نے یادوںوں قوموں نے ذوالقرنین سے یا جو حجاج کی شکایت کی ہو گی۔ اور چونکہ یہ غیر متمدن قومیں تھیں۔ اس لئے ان کی نسبت فرمایا کہ لا یکا دوں یقینوں قول

اس کے بعد ذوالقرنین کا جو وصف سامنے آتا ہے وہ اس کی عدالت گسترشی اور خدمت انسانی کی فیاضانہ سرگرمی ہے اور یہ اوصاف سائز کی تاریخی سیرت کی اس درجہ آشکارا حقیقتیں ہیں کہ مورخ کی نگاہ کسی دوسری طرف اٹھتی نہیں سکتی۔
قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے مغرب میں جو قوم ملی تھی اس کی نسبت حکم الہی ہوا تھا۔

"یاذالقرنین! اما آن تعذب و اما آن میختن فیحیم حنا(۸۲)"

"یعنی یہ قوم اب تیرے بس میں ہے۔ جس طرح چاہے تو ان کے ساتھ سلوک کر سکتا ہے۔ خواہ سزادے خواہ انہیں اپنا دوست بنالے۔"
یقیناً یہ لیڈیا کی یونانی قوم تھی۔ اس کے بادشاہ کروئیس نے تمام عہد و پیمان اور باہم رشتہ داریاں بھلا کر بلا وجہ سائز پر حملہ کر دیا تھا۔ اور صرف خود ہی حملہ آور نہیں ہوا تھا۔ بلکہ وقت کی تمام طاقت ور حکومتوں کو بھی اس کے خلاف ابھار کر اپنے ساتھ کر لیا تھا۔ اب جب تائید الہی نے اپنا کرشمہ دکھایا اور لیڈیا مسخر ہو گیا تو حکم الہی ہوا۔ یہ لوگ بالکل تیرے رحم پر ہیں۔ جس طرح تو چاہے ان کے ساتھ سلوک کر سکتا ہے۔ کیوں کہ یہ اپنے ظلم و شرارت کی وجہ سے ہر طرح سزا کے مستحق ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ تائید الہی نے تیر اساتھ دیا۔ دشمنوں کو مسخر کر دیا۔ اب وہ بالکل تیرے اختیار میں ہیں۔ لیکن تجھے بدله نہیں لینا چاہیے۔ وہی کرنا چاہیے جو نیکی اور فیاضی کا مقضیا ہے۔ چنانچہ ذوالقرنین نے ایسا ہی کیا۔ آیہ نمبر 88 کے مطابق اس نے اعلان کیا کہ میں پچھلے جرم کی بنابر کسی کو سزا نہیں دینا چاہتا۔ میری جانب سے عام بخشش کا اعلان ہے۔ البتہ آئندہ جو کوئی برائی کرے گا بلاشبہ اسے سزادوں گا۔ پھر اسے مرتا ہے۔ اور آخرت کا عذاب سخت جھیلنا ہے۔ اور جو لوگ میرے احکام مانیں گے۔ اور نیک کردار ثابت ہوں گے تو ان کے لیے ویسا ہی بہتر اجر بھی ہو گا۔ اور وہ میرے احکام بھی بہت آسان پائیں گے۔ میں بند گان خدا پر سختی کرنا نہیں چاہتا۔ یہ ہو بہو اس طرز عمل کی تصویر ہے جس کی تفصیل ہمیں یونانی تاریخوں کے صفحات میں ملتی ہے اور جسے زمانہ حال کے تمام محققین تاریخ نے ایک مسلمہ تاریخی حقیقت تسلیم کر لیا ہے۔ تمام یونانی مورخ بالاتفاق شہادت دیتے ہیں کہ سائز نے فتح کے بعد باشند گان لیڈیا کے ساتھ جو سلوک کیا وہ صرف منصفانہ ہی نہ تھا، بلکہ وہ اس سے بھی زیادہ تھا۔ وہ فیاضانہ تھا۔ وہ اگر اپنے دشمن کے ساتھ سختی کرتا تو یہ انصاف ہوتا۔ کیوں کہ نا انصافی ان کی ہی تھی۔ لیکن وہ صرف منصف ہونے پر قانون نہیں ہوا۔ اس نے رحم و بخشش کا شیوه اختیار کیا۔ ہیر و ڈوٹس لکھتا ہے کہ سائز نے اپنی فوج کو حکم دے دیا تھا کہ دشمن کی فوج میں سے بھی جو کوئی نیزہ بھجا دے۔ اسے ہرگز قتل نہ کیا جائے۔

کروئیس شاہ لیڈیا کی نسبت صریح حکم تھا کہ کسی حال میں بھی اسے گزندہ پہنچائی جائے۔ اگر وہ مقابلہ کرے جب بھی اس پر تلوار نہیں اٹھانی چاہیے۔ اس حکم کی فوج نے اس دیانت داری کے ساتھ تعییل کی کہ باشند گان کو جنگ کی مصیبت ذرا بھی محسوس نہ ہوئی۔ یہ گویا محض فرمان رواخاند ان کا ایک شخصی انقلاب تھا کہ کروئیس کی جگہ سائز نے لے لی۔ اس سے زیادہ کوئی انقلاب ملک و قوم کو محسوس ہی نہیں ہوا۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سائز کی فتح یونانی دیوتاؤں کی شکست تھی۔ کیوں کہ وہ اس مصیبت سے اپنے پرستار کروئیس کو نہ بچا سکے۔

حالانکہ حملہ سے پہلے اس نے مندوں کے ہاتھ سے استصواب کر لیا تھا اور ڈیلفی کے ہاتھ نے فتح کامرانی کی بشارت دی تھی۔ میں قدرتی طور پر واقعات کی یہ رفتار یونانیوں کے لیے خوش گوارنہ ہو سکی۔ اور اس امر کی کوشش شروع ہو گئی کہ اس اصحاب کہف شکست میں بھی اخلاقی اور مذہبی فتح مندی کی شان پیدا کر دی جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کرونسس کا معاملہ اچانک ایک پراسرار افسانہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور یونانی دیوتا اپنے سارے مجرموں کے ساتھ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ہیرودوٹس لیڈیا کے باشندوں کی یہ روایت نقل کرتا ہے کہ ڈیلفی کے ہاتھ کا جواب غلط نہ تھا مگر کر ونس نے جنگ کے جوش و طلب میں اس کا صحیح مطلب نہ سمجھا۔

ہاتھ نے کہا تھا کہ اگر اس نے پارسیوں پر حملہ کیا تو وہ ایک بڑی مملکت تباہ کر دے گا۔ مگر اس نے خیال کیا بڑی مملکت سے مقصود پارسیوں کی مملکت ہے۔ نیز وہ کہتا ہے پہلے سائرس نے حکم دیا تھا کہ لکڑیوں کی چتاتیر کی جائے اور اس پر کرونسس کو بٹھا کر آگ لگادی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور آگ لگادی گئی۔ لیکن پھر جب کرونسس کی بعض باتیں سنیں تو بے حد متاثر ہوا۔ اور آگ بجھانے کا حکم دیا۔ لیکن اب آگ پوری طرح مشتعل ہو چکی تھی۔ ممکن نہ تھا کہ اسے فوراً بجھایا جائے۔ یہ حال دیکھ کر کرونسس نے اپا لو دیوتا کو پکارا۔ اور باوجود آسان بالکل صاف تھا اچانک بارش شروع ہو گئی اور اس طرح اس مجرزے نے بر وقت ظاہر ہو کر اس کی جان بچا لی۔

لیکن خود ہیرودوٹس اور زینون کی تصريحات سے جو حقیقت معلوم ہوتی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ سائرس یا تو کرونسس کے عزم و صبر کا امتحان یعنی اچھا ہتا تھا۔ یا یہ بات آشکارا کر دینا چاہتا تھا کہ یونانیوں کے خود ساختہ دیوتا اپنے عبادت گزاروں کی کچھ مدد نہیں کر سکتے۔ اور جن دیوتاؤں کی مزعومہ بشارت پر اعتقاد کر کے جنگ کی گئی تھی ان میں اتنی بھی طاقت نہیں کہ اپنے پرستار کو زندہ جلنے کے عذاب سے بچا لیں۔ یعنی مقصود یہ تھا کہ پہلے چتاتیر بٹھایا جائے، آگ بھی لگادی جائے۔ لیکن جب وہ خود اور تمام لوگ دیکھ لیں کہ دیوتاؤں کا کوئی مجرمہ ظاہر نہیں ہوا تو پھر اسے بخش دے۔ اور عزت و آرام کے ساتھ اپنے ہمراہ لے جائے۔

دوسری علت زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے کیوں کہ خود ہیرودوٹس کی روایت میں اس کی جھلک موجود ہے اور یونانی افسانہ میں اپالو کی نمود بھی اسی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ سائرس نے اپنے عمل سے جو حقیقت آشکارا کر دی تھی۔ یونانی افسانہ نے اس کا توڑ کرنے کے لیے اپالو کا مجذہ گھٹ لیا۔ قرآن نے ذوالقرنین کا یہ اعلان نقل کیا ہے کہ آئندہ جو ظلم کرے گا سزا اپائے گا۔ جو حکم مانے گا اور نیک عمل ہو گا اسے انعام ملے گا۔ یعنی زینون کی بھی ایسی ہی روایت ہے۔ قرآن میں ہے کہ

"وَسَنَقُولَ لِمَنْ أَمْرَنِي سِرَا"

یعنی اگر لوگوں نے نیک عملی اختیار کی تو دیکھ لیں گے کہ میرے احکام و قوانین میں ان کے لیے سختی نہ ہو گی۔

تمام سوراخ بالاتفاق شہادت دیتے ہیں کہ اس کے احکام و قوانین ایسے ہی تھے۔ وہ منفوحہ ممالک کے باشندوں کے لیے سرتاسر شفقت و مرحمت تھا۔ اس نے ان تمام بوجھل ٹیکسیوں اور خراجوں سے رعایا کو نجات دے دی، جو اس عہد کے تمام حکمران وصول کیا کرتے تھے۔ اس نے جس قدر احکام و فرماں نافذ کئے وہ زیادہ سے زیادہ نرم اور زیادہ سے زیادہ ہلکے تھے۔

ہم نے Oracle کے لیے ہاتھ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ اگرچہ اس کے لیے مترادف لفظ نہیں ہے۔ لیکن اصطلاح کا مطلب بہتر طریقہ پر واضح کرتا ہے۔ یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ مندروں میں ہاتھ غبی کی صدائیں سنی جاتی ہیں۔ اور خاص پچاریوں پر دیوتاؤں کا الہام ہوتا ہے۔ اس غرض سے خاص خاص مندروں کی شہرت تھی۔ لوگ چڑھاوے چڑھا کر اپنے سوالات پیش کرتے اور مجاور دیوتاؤں کی طرف سے جوابات سنادیتے۔

تمام مورخ بالاتفاق شہادت دیتے ہیں کہ اس کے احکام و قوانین ایسے ہی تھے۔ وہ مفتوحہ ممالک کے باشندوں کے لیے سرتاسر شفقت و مرحمت تھا۔ اس نے ان تمام بو جھل ٹیکسوں اور خراجوں سے رعایا کو نجات دے دی، جو اس عہد کے تمام حکمران وصول کیا کرتے تھے۔ اس نے جس قدر احکام و فرائیں نافذ کئے وہ زیادہ سے زیادہ نرم اور زیادہ سے زیادہ بلکہ تھے۔

یہ تو صرف اس کی مغربی فتحِ مندی کی سرگزشت تھی۔ اب دیکھنا چاہیے کہ اس کے اعمال کی عام رفتار کیسی رہی؟ اور قرآن کا بیان کردہ وصف کہاں تک اس پر راست آتا ہے۔۔۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم یونانی مورخوں کی شہادتوں پر متوجہ ہوں، یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ یونانی مورخ سائرس کے ہم قوم نہیں تھے، ہم وطن نہیں تھے اور ہم مذہب نہیں تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ دوست بھی نہیں تھے۔ سائرس نے لیڈیا کو شکست دی تھی۔ اور لیڈیا کی شکست یونانی قومیت یونانی تہذیب اور سب سے زیادہ اہم یہ کہ خود یونانی مذہب کی شکست تھی۔ پھر سائرس کے جانشینوں نے براہ راست یونانیوں کو زیر کیا تھا۔ اور ہمیشہ کے لیے دونوں قومیں ایک دوسرے کی حریف ہو گئی تھیں۔

ایسی حالت میں قدرتی طور پر یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ یونانی دماغ اپنے حریف کی مدحت سرائی کا شائق ہو گا۔ تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر مورخ اس کی غیر معمولی عظمتوں اور ملکوتی صفتوں کی مدحت سرائی میں رطب اللسان ہے اور اس لئے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کے محاسن نے ایک ایسے عالم گیر اعتراض و تاثر کی نوعیت اختیار کر لی تھی کہ دوست دشمن کا کوئی امتیاز باقی نہیں رہا تھا۔ سب کے دلوں میں ان کا اعتقاد پیدا ہو گیا تھا۔ سب کی زبانوں پر ان کی مدحت سرائی تھی۔ اور محاسن وہی ہیں جن کی حریفوں کو بھی شہادت دینی پڑے۔ یعنی:

وَلِيْحَةُ شَهَدَتْ بِهَا ضَرَاهِمَا

وَالْفَضْلُ مَا شَهَدَتْ بِهِ الْأَعْدَاءُ

"اور خوبصورتی یہ ہے کہ سوکنیں بھی اس کی گواہی دیں اور فضیلت تو وہ ہے جس کی دشمن بھی شہادت دیں۔"

زینون لکھتا ہے:- "سائرس ایک نہایت دانش مند، سنجیدہ اور ساتھی رحم دل فرمازو رکھتا۔ اس کی شخصیت ہر طرح کے شاہی اوصاف اور حکیمانہ فضائل کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ تھی۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ اس کی شوکت و حشمت سے کہیں زیادہ اس کی مالی حوصلگی اور سیر چشمی تھی۔ اور اس کی فیاضی اور رحم دلی اپنی کوئی دوسرا مثال نہیں رکھتی۔ انسان کی خدمت اور ہمدردی اس کی شاہانہ طبیعت کا سب سے بڑا جوہ رکھتا۔ وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتا تھا کہ مصیبت زده انسانوں کی خبر گیری کرے اور مظلوموں کو ظلم سے نجات دلائے۔ درماندہ انسانوں کا ہاتھ پکڑے، غم زدوں کے دکھ درد میں شریک ہو۔ پھر ان تمام عالی صفتوں کے ساتھ عاجزی اور انکساری اس کے حسن و کمال کا سب سے بڑا ذیور تھی۔ اس نے ایک ایسے تخت پر بیٹھ کر

، جس کے آگے تمام قوموں کے سر جھک گئے تھے۔ اور ایک ایسے خزانے کا مالک ہو کر جس میں تمام دنیا کی دولت سمٹ آئی تھی۔ کبھی گوارا نہیں کیا کہ فخر و غرور کو اپنے دماغ میں جگہ دے۔
ہیر و ڈوٹس لکھتا ہے:-

"وہ ایک نہایت ہی مخیر پادشاہ تھا۔ اسے دنیا کے تمام بادشاہوں کی طرح دولت جمع کرنے کی حرص نہیں تھی۔ بلکہ وہ جو دو سخاوت کا شوق رکھتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ دنیا کی سب سے بڑی دولت اس بات میں ہے کہ نوع انسانی کی بھلائی کا موقع ملے اور مظلوموں کی دادرسی ہو۔
لی سیاز لکھتا ہے:-

اس کا عقیدہ یہ تھا کہ دولت بادشاہوں کے ذاتی عیش و آرام کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ اس لئے ہے کہ رفاه عام کے کاموں میں خرچ کی جائے اور ماتحتوں کو اس سے فیض پہنچے۔ چنانچہ اس کی اس فیض رسانی نے اس کی تمام رعایا کے دل اس کے ہاتھوں میں دے دیئے تھے۔ وہ اس کے لیے خوشی خوشی اپنی گرد نہیں کٹوادیتے۔"

سب سے زیادہ نمایاں بات جوان تمام مورخوں کے صفحات پر ملتی ہے وہ سائز کی شخصیت کی غیر معمولی نمود ہے۔ سب کہتے ہیں کہ وہ جس عہد میں پیدا ہوا، درحقیقت اس کی مخلوق نہیں تھا بلکہ اپنے عہد سے بہت آگے کافر دھا۔ اس کی ایک بالا تر شخصیت تھی۔ جسے قدرت نے اپنا کرشمہ دکھانے کے لیے نمودار کر دیا تھا۔ دنیا کے کسی حکیم، کسی دانانے اس کی تربیت نہیں کی۔ وقت کے متعدد ملکوں میں سے کسی ملک میں اس کی پرورش نہیں ہوئی۔ وہ محض قدرت کا پروردہ تھا۔ اور قدرت ہی کے ہاتھوں نے اسے اٹھایا تھا۔ وہ فارس کے مشرقی پہاڑوں کا چروہا تھا۔ تاہم یہ کسی عجیب بات ہے کہ یہی چروہا جب دنیا کے سامنے آیا تو حکمرانی کا سب سے بڑا جلوہ، دانش کا سب سے بڑا پیکر اور فضیلت کا سب سے بڑا نمونہ، اسی سائز کی صورت میں ان کے سامنے تھا۔

سائز اور سکندر، ایک موازنہ:

سکندر اعظم کو ارسطو کی تعلیم و تربیت نے تیار کیا تھا۔ اور بلاشبہ وہ دنیا کی تاریخ کا بہت بڑا فتح نکلا۔ لیکن کیا انسانیت و اخلاق کا بھی کوئی گوشہ فتح کر سکا؟ سائز کے لئے ہمیں کوئی ارسطو نہیں ملتا۔ اس نے انسانی حکمت کی درس گاہ کی جگہ قدرت کی درس گاہ میں پرورش پائی تھی۔ تاہم اس نے سکندر کی طرح صرف ملکوں ہی کو نہیں بلکہ انسانیت و فضائل کی مملکتوں کو بھی مسخر کر لیا تھا۔ سکندر کی تمام فتوحات کی عمر اس سے زیادہ نہ تھی، جتنی خود اس کی عمر تھی۔ لیکن سائز کی فتوحات نے جو اینٹی چن دی تھیں وہ دوسو بر س تک نہ ہل سکیں۔ سکندر کے دم توڑتے ہی اس کی مملکت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ لیکن سائز کی فتوحات میں صرف مصر کا خانہ خالی رہ گیا تھا۔ اس کے فرزند، کیقباد نے اسے بھی بھر دیا۔ اور پھر چند برسوں کے بعد دنیا کی عالم گیر سلطنت ظہور میں آگئی جو ایشیا، افریقہ اور یورپ کے اٹھائیں ملکوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس پر سائز کا پڑپوتا، داریوش تن تہا حکمران تھا۔

سکندر کی فتوحات صرف جسم کی فتوحات تھیں، جنہیں قہر و طاقت نے سر کیا تھا۔ لیکن سائز کی فتوحات روح و دل کی فتوحات تھیں۔ جنہیں انسانیت و فضیلت نے سر کیا تھا۔ پہلی سراٹھاتی ہے لیکن دیر تک نہیں سکتی۔ دوسری تک جاتی ہے اور پھر ٹلتی نہیں۔ سائز فتح بابل کے بعد دس برس تک

زندہ رہا۔ اب اس کی حکومت عرب سے لے کر بحر اسود تک اور ایشیاء کی تمام قویں اس کے ماتحت آچکی تھیں۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس تمام عرصہ میں بغاوت اور سرکشی کا ایک حداد بھی نہیں ہوا۔ کیوں کہ زینون کے لفظوں میں وہ صرف بادشاہ ہی نہ تھا۔ بلکہ انسانوں کا شفیق مرbi اور قوموں کا رحم دل باپ تھا اور رعایا سخت گیر حکمرانوں سے بغاوت کر سکتی ہے، لیکن اولاد اپنے شفیق باپ سے باغی نہیں ہو سکتی۔ موجودہ زمانے کے تمام مورخ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ ایک حیرت انگیز خصوصیت تھی۔ یہ ایسی خصوصیت تھی جو آگے چل کر و من ایم پارز کو بھی نصیب نہ ہوئی۔

سب متفقہ شہادت دیتے ہیں کہ اس عہد کے بادشاہوں کی سخت گیری، سخت دل، ظالمانہ طبیعت اور بیبت انگیز طریقہ تعذیب کی چھوٹی سے چھوٹی مثال بھی سارے س کے عہد میں نہیں ملتی۔

یاد رہے کہ یہ محض قدیم یونانی مورخوں کی روایات ہی نہیں بلکہ موجودہ زمانے کے تمام محققین تاریخ کی تاریخی مسلمات ہیں۔ بالاتفاق یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ سارے س تاریخ قدیم کی سب سے بڑی شخصیت ہے۔ جس میں بیک وقت فتوحات کی وسعت، فرمازوائی کی عظمت اور اخلاق انسانیت کی فضیلت جمع ہو گئی تھی۔ اور وہ جس عہد میں ظاہر ہوا، اس عہد میں اس کی شخصیت ہر اعتبار سے انسانیت کا ایک پیام اور قوموں کی نجات تھی۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر جی بی گرنڈی G.B.Grundy جو موجودہ زمانہ میں تاریخ قدیم کے ایک مستند ماہر ہیں اور جن کی کتاب گریٹ پر شین

Great Persian War

نہایت مقبول ہو چکی ہے۔ لکھتے ہیں:-

" یہ حقیقت بالکل آشکارا ہے کہ سارے س کی شخصیت اپنے عہد کی ایک غیر معمولی شخصیت تھی۔ اس نے اپنی تمام معاصر قوموں کے دلوں پر اپنا حیرت انگیز تاثر نقش کر دیا۔ اس کی ابتدائی نشوونما بالائی فارس کے غیر آباد اور دور دراز گوشوں میں ہوئی۔ جس کی سرگزشت نے ایک افسانہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اس کی ابتدائی تربیت کی روایتیں اس سے ڈیڑھ سو برس بعد زینون نے مدون و مرتب کیں جو سفر اط کاشا گرد تھا۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان تمام روایتوں میں اس کا فضل انسانیت کا جو ہر عام طور پر نمایاں ہے، خواہ ہم ان روایتوں کو اہمیت دیں، یا نہ دیں۔ تاہم یہ حقیقت ہر حال میں غیر متزلزل رہتی ہے کہ اس کی تدبیر و سیاست کا دامن اس کی انسانیت و فضیلت کے جو ہر سے بندھا ہوا تھا۔ اور جب یہ خصوصیت آشوری و بابلی شہنشاہوں کی بد عملیوں کے مقابلے میں لائی جاتی ہے، تو اس کی شریفانہ نمود اور زیادہ در خشنده ہو جاتی ہے۔"

پھر آگے چل کر پروفیسر گرنڈی لکھتے ہیں:-

" یہ فی الحقیقت ایک حیرت انگیز کامیابی تھی۔ بارہ برس پہلے وہ ایک چھوٹی سی ریاست "انشان" کا ایک گمنام رئیس تھا۔ اور اب ایشیاء کی وہ تمام ملکتیں اس کے زیر فرمان تھیں جہاں پچھلی قوموں کی بڑی بڑی عظمتیں ظہور میں آ چکی تھیں۔ ان تمام بادشاہتوں میں، جنہوں نے زمین کے مالک ہونے کے دعوے کئے، ایک بادشاہت بھی ایسی نہ تھی جو اب اپنی ہستی کا کوئی موثر ظہور رکھتی ہو۔"

آکادی مملکت (Acadian Empire) کے نیم اصنامی سارگون سے لے کر بونوکدنزار (بخت نصر) تک سب کی مملکتیں اس کے آگے سر بہ بود ہو گئی تھیں۔ وہ صرف ایک بڑا فتح ہی نہیں تھا بلکہ وہ ایک بڑا حکمران بھی تھا۔ قوموں نے یہ نیا دور صرف قبول ہی نہیں کیا بلکہ اس کا استقبال کیا۔ ان دس برسوں میں جو فتح بابل کے بعد گزرے۔ اس کی تمام و سعی مملکت میں ایک بغاوت کا واقعہ بھی نظر نہیں آتا۔

بلashere اس کی رعایا پر اس کی طاقت کا رعب چھایا ہوا تھا۔ لیکن وہ کوئی وجہ نہیں رکھتی تھی کہ اس کی سخت گیری سے ہر انسان ہو۔ اس کی حکومت قتل و سلب کی سزاویں سے بالکل نا آشنا ہی۔ اب تازیاں ہوں سے مجرموں کو نہیں پیٹا جاتا تھا اب قتل عام کے احکام صادر نہیں ہوتے تھے۔ اب قوموں اور قبیلوں کو جلاوطن نہیں کیا جاتا تھا۔

برخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے آشوری اور بابلی بادشاہوں کے تمام مظالم کے اثرات بہ یک جنبش قلم محو کر دیئے۔ جلاوطن قومیں اپنے اوطن میں لوٹائی گئیں۔ ان کے معبد اور معبدوں نہیں واپس دے دیئے گئے۔ قدیم رسموں اور عبادتوں کے خلاف کوئی جرو تشدیقی نہیں رہا۔ ہر قوم کے ساتھ پوری مذہبی آزادی دی گئی۔ دنیا کی گذشتہ عالم گیر دہشت ناکی کی جگہ ایک عالم گیر رواداری اور عفو و بخشش کا مبارک دور شروع ہو گیا۔ غور کیجیے کہ قرآن نے چند لفظوں کے اندر جو اشارات کر دیئے ہیں۔ آج تاریخ کا دستان سراکس طرح اس کے ایک ایک حرفاں کی شرح و تفصیل سنارہا ہے۔ اب چند لمحوں کے لیے ان تصریحات پر غور کیجیے جو تواریخ کے صحائف میں درج ہیں۔ کس طرح وہ سائز کی شخصیت کی سب سے بڑی خصوصیت واضح کر رہے ہیں۔ اور کس طرح قرآن کے اشارات بھی ٹھیک ٹھیک ان کی تصدیق ہیں۔

یسعیاہ بنی علیہ السلام کی کتاب میں ہے کہ "خداؤند کہتا ہے کہ: خورس میراچرواہا ہے۔" اور پھر یہ بھی کہا ہے کہ "وہ میرا مسح ہے۔" اور میرا بنی علیہ السلام کا بیان اوپر گزر چکا ہے کہ وہ بابلیوں کے ظلم سے نجات دلائے گا۔ اب دیکھیے کہ کیا اس کی شخصیت ٹھیک ٹھیک ایک موعود اور منتظر نجات دہنہ کی شخصیت تھی یا نہ تھی؟

جب ہم اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور پھر سائز کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ اول نظریہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ اس کا ظہور ٹھیک ٹھیک ایک ایسی شخصیت کا ظہور تھا، جس کے لیے وقت کی تمام قومیں چشم بردا ہوں۔ قوموں کا انتظار ان کی زبانوں پر نہیں ہوتا۔ ان کے حالات کے قدرتی تقاضے میں ہوتا ہے۔

غور فرمائیے۔

اس عہد کی رفتار زمانہ کا قدرتی تقاضا کیا تھا؟ یہ تاریخ کے صبح تمدن کی وہ نمود تھی جس کی روشنی میں ہم انسانی حکمرانی کی ساری تاریکیاں پھیلی ہوئی دیکھتے ہیں۔ صاف دلخالی دیتا ہے کہ اس وقت تک انسانی فرمان روائی کی عظمت صرف قہر و غضب ہی کی نقاپ میں رونما ہوئی تھی اور سب سے بڑا حکمران وہی سمجھا جاتا تھا جو سب سے زیادہ انسانوں کے لیے خوفناک ہو۔

آشور بنی پاپل نیو اکاسب سے بڑا بادشاہ تھا۔ اس لئے کہ وہ شہروں کے جلانے اور آبادیوں کے ویران کرنے میں سب سے زیادہ بے باک تھا۔ بابل کی نشأۃ ثانیہ میں بخت نصر سب سے بڑا فتح تھا۔ اس لئے کہ قوموں کی ہلاکت اور مملکتوں کی ویرانی میں سب سے زیادہ قہر مان تھا۔ مصریوں آکادیوں، ایلامیوں، آشوریوں اور بابلیوں سب میں انسانی حکومت و عظمت کے مظاہر خوفناکی اور دہشت انگیزی کے مظاہر تھے۔ اور ان کی شخصیتوں نے

دیوتائی الوہیت کی تقدیس سے مل کر انسانوں کے قتل و تعذیب کا ہونا ک استحقاق حاصل کر لیا تھا۔ سائرس کے ظہور سے پچاس برس پہلے بنو کر نزار یعنی بخت نصر کی شہنشاہی کا ظہور ہوا۔ اور ہمیں معلوم ہے کہ اس نے بیت المقدس پر پیغم تین حملے کر کے نہ صرف دنیا کا سب سے بڑا زیرخیز علاقہ تاراج و ویران کر دیا بلکہ فلسطین کی پوری آبادی کو اس طرح ہنکار بابل لے گیا کہ جوزیفس کے لفظوں میں "کوئی سخت سے سخت بے رحم قصائی بھی اس وحشت و خوف خواری کے ساتھ بھیڑوں کو منجع خانے میں نہیں لے جاتا"۔

پھر کیا ان حالات کا قدرتی تقاضا یہ نہ تھا کہ دنیا ایک نئی شخصیت کے لیے چشم برآہ ہو؟ تو میں ایک نجات دہنده کی تلاش کر رہی ہوں؟ ایک ایسے نجات دہنده کی جو انسانوں کے گلے یاریوڑ کے لئے خدا کا بھیجا ہوا "چروہا" ہو جو ان کی بیڑیاں کاٹے اور ان کے سروں کا بو جھ بھاکر دے۔ جو دنیا کو اس ربانی صداقت کا سبق دے دے کہ انسانی حکمرانی کی نوع انسانی کی خدمت کے لیے ہونی چاہیے۔ دہشت انگیزی اور خوفناکی کے لیے نہیں۔ دنیا بادشاہوں کے ہاتھوں سے تنگ آچکی تھی۔ اب وہ ایک "چروہے" کے لیے مضطرب تھی اور یسعیاہ نبیؐ کے لفظوں میں خدا کا وہ فرستادہ چروہا نمودار ہو گیا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں زینون کے لفظوں میں کہ: "قوموں نے اسے قبول ہی نہیں کیا بلکہ اس کے استقبال کے لیے بے اختیار لپکیں۔ کیوں کہ وہ وقت کی جستجو کا قدرتی سراغ اور زمانہ کی طلب کا قدرتی جواب تھا۔ اور اگر رات کی تاریکی کے بعد صحیح کی روشنی کا خیر مقدم کیا جاتا ہے، تو ممکن نہ تھا کہ انسانی شقاوتوں کی اس طولانی تاریکی کے بعد صحیح سعادت کی اس جہاں تابی کا استقبال نہ کیا جاتا۔

(سارگون، یا عظیم سارگون، آکادی سلطنت کا بانی تھا، جس نے چوبیسویں صدی قبل از مسیح میں اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔)

غور فرمائیے کہ یسعیاہ نبی علیہ السلام کے صحیفے کا یہ جملہ صورت حال کی کیسی ہو بھو تصور ہے کہ "وہ میرا چروہا ہو گا۔ وہ میری ساری مرضی پوری کرے گا۔ میں اس کا دہنہاتھ کپڑا کر قوموں کو اس کے قابو میں دے دوں گا۔ اور بادشاہوں کی کمریں اس کے آگے کھلواؤں گا۔ میں اس کے آگے چلوں گا۔ میڑھے راستے اس کے لیے سیدھے کر دوں گا۔"

سارے مورخ گوئی دے رہے ہیں کہ وہ یعنی سائرس ایک چروہے کی طرح آیا۔ اور اس نے بندگان خدا کی رکھوائی کی۔ سب کہہ رہے ہیں کہ اس نے جس ملک کا رخ کیا اس کی شقاوتوں ختم ہو گئی۔ وہ جس قوم کی طرف بڑھا اس کی بیڑیاں کٹ گئیں۔ اس نے جس گروہ کے سر پر ہاتھ رکھا اس کے سارے بوجھ ملکے ہو گئے۔ وہ صرف نبی اسرائیل ہی کا نہیں بلکہ اس عہد کی تمام قوموں کا نجات دہنده تھا۔

یاد رہے کہ یسعیاہ نبیؐ کی اس پیشین گوئی میں اسے خدا کا مسیح بھی کہا گیا ہے۔ اور تورات کی اصطلاح میں مسیح وہ ہوتا ہے جسے خدا اپنی برکتوں کے ظہور کے لیے برگزیدہ کر لے اور خدا کے برادر است مسح ہونے کی وجہ سے مقدس ہو۔ چنانچہ حضرت داؤدؑ کی نسبت بھی آیا ہے کہ وہ مسیح تھے۔ سائرس کی نسبت بھی یہی کہا ہے اور اسی طرح بنی اسرائیل کی نجات کے لیے ایک آخری مسیح کی پیشین گوئیاں موجود ہیں۔ سائرس کو مسیح کہنا بلاشبہ اس کے تقدیس اور بارگاہِ الٰہی میں برگزیدگی کی سب سے زیادہ واضح اور قطعی اسرائیلی شہادت ہے۔ اس سلسلے میں آخری وصف جو ذوالقرنین کا سامنے آتا ہے وہ اس کا ایمان باللہ ہے۔ قرآن کی آیتیں اس بارے میں ظاہر و قطعی ہیں۔ وہ ایک خدا پرست انسان تھا۔ آخرت پر یقین رکھتا تھا۔ احکامِ الٰہی کے مطابق

عمل کرتا تھا۔ اور اپنی تمام کامرنیوں کو اللہ کا فضل و کرم سمجھتا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا سائرس کا بھی ایسا ہی اعتقاد عمل تھا۔ لیکن تمام پچھلی تفصیلات پڑھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ نہیں تھا؟

یہودیوں کے صحائف کی واضح شہادت موجود ہے کہ خدا نے اسے اپنا فرستادہ اور مسیح کہا اور وہ نبیوں کا موعود و منتظر تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی ہستی خدا کی نا فرمان ہستی نہیں ہو سکتی۔ جس کا داہناتھ خدا نے پڑا ہوا اور جس کی طیڑھی را ہیں وہ درست کرتا جائے، یقیناً وہ خدا کان پسندیدہ بندہ نہیں ہو سکتا۔ خدا صرف انہی کا ہاتھ پکڑتا ہے۔ جو برگزیدہ اور مقدس ہوتے ہیں اور صرف انہی کو اپنا فرستادہ کہتا ہے جو اس کے چنے ہوئے اور اس کی درست ٹھہرائی ہوئی را ہوں پر چلنے والے ہوتے ہیں۔

آن کل کے اصحاب نقد و نظر یسوعیہ نبی گئی اس پیشین گوئی کو مشتبہ سمجھتے ہیں کیوں کہ یہ سائرس سے ڈیڑھ سو برس پہلے کی گئی تھی۔ لیکن اگر اس سے قطع نظر کر لی جائے جب بھی صورت حال پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیوں کہ خود سائرس کے عہد میں جو اسرائیلی نبی موجود تھے ان کی شہادتیں موجود ہیں۔ اور وہ صاف کہہ رہتی ہیں کہ یہودیوں کا عام اعتقاد یہی تھا۔ اور اسی حیثیت سے اس کا استقبال کیا تھا۔ حزقیل اور دانیال، سائرس کے معاصر تھے۔ اور دارا کے عہد تک زندہ رہے۔ ان دونوں کی تصریحات سائرس کی نسبت موجود ہیں، پھر دارا کے زمانہ میں حجی (Haggai) اور ذکریا کے صحیفے مرتب ہوئے اور ان زر کسیں (ارد شیر یا رتخنشت) کے عہد میں عزیر (Ezra) اور نہمیا (Nehemiah) کا ظہور ہوا۔ ان کی سب کی شہادتیں بھی موجود ہیں اور ان سب سے قطعی طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سائرس نبی اسرائیل کی ایک موعود ہستی تھی۔ اور خدا نے اسے برگزیدگی کے لیے چن لیا۔ اگر یہودیوں کا عام اعتقاد یہ تھا تو کیا ایک لمحے کے لیے یہ بات تسلیم کی جاسکتی ہے کہ وہ ایک بت پرست انسان کی نسبت ایسا اعتقاد رکھنے کی جرات کرتے؟ فرض فرمائیے یہ تمام پیشین گوئیاں سائرس کے ظہور کے بعد بنائی گئیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہودیوں ہی نے بنائیں۔ اور یہودیوں ہی میں پھیلیں۔ حتیٰ کہ ان کی مقدس کتاب میں داخل ہو گئیں۔ پھر کیا ممکن تھا کہ بت پرست انسان کے لیے ایسی پیش گوئیاں بنائی جاسکتیں؟ کیا ممکن تھا کہ بت پرست کو اسرائیلی وحی کا مددوح اور اسرائیلی نبیوں کا موعود بنادیا جاتا؟

یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اجنیوں اور غیر اسرائیلیوں کے خلاف یہودیوں کا تعصب بہت ہی سخت تھا۔ ان کے نسلی غرور پر اس سے زیادہ اور کوئی بات شاق نہیں گزرتی تھی کہ کسی غیر اسرائیلی انسان کی بزرگی کا اعتراف کریں۔ ظہور اسلام کے وقت بھی یہی بات انہیں اعتراف حق سے روکتی تھی کہ

"ولَا تُؤْمِنُوا إِلَّا مَنْ تَعْجِلُونَ" (آل عمران: ۷۳)

اور کسی پر ایمان نہ لاؤ، گر اس پر جو تمہارے دین کی پیروی کرے۔"

تاہم وہ سائرس کی فضیلت کے آگے جھک گئے جو ان کے لیے ہر اعتبار سے اجنبی تھا۔ اور نہ صرف اس کی بزرگی ہی کا اعتراف کیا بلکہ اس کو نبیوں کا موعود اور خدا کا برگزیدہ تسلیم کر لیا۔ یہ صورت حال اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ سائرس کی شخصیت ان کے لیے بڑی ہی محبوب شخصیت تھی۔ اور اس کی فضیلتیں ایسی قطعی اور آشکارا تھیں کہ ان کے اعتراف میں نسلی عصیت کا جذبہ بھی حائل نہ ہو سکا۔ ظاہر ہے کہ ایک بت پرست انسان کے لیے جو اجنبی بھی ہو، یہودیوں میں ایسی محبوبیت نہیں پیدا ہو سکتی تھی۔ اگر ایک بت پرست بادشاہ نے انہیں ظالم حکمران کے ظلم سے نجات دلائی تھی تو وہ

اس کی شہانہ عظمتوں کی مذاہی کرتے، مگر خدا کا مسیح اور برگزیدہ کبھی نہ سمجھتے۔ ضروری ہے کہ اس کی فضیلتیں مذہبی ہوں۔ ضروری ہے کہ مذہبی حیثیت سے بھی عقائد پر ان کا اتفاق موجود ہو۔ یہ یہودیوں کی پوری تاریخ میں غیر اسرائیلی فضیلت کے اعتراض کا تہذیب اقمع ہے۔ اور ممکن نہیں کہ یہ اتفاق ایک ایسے انسان کے لیے ہوا ہو، جسے وہ مذہبی حیثیت سے محترم نہ سمجھتے ہوں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سائرس کے دینی عقائد کے بارے میں ہماری معلومات کیا ہیں؟ تاریخی حیثیت سے یہ امر قطعی ہے کہ سائرس زردشت کا بیرون تھا، جسے یونانیوں نے "زاردست رو" کے نام سے پکارا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ غالباً اس سائرس ہی کی شخصیت ہے جو اس نئی دعوت کی تبلیغ و عروج کا ذریعہ ہوئی۔ اس نے فارس اور میڈیا میں نئی شہنشاہی کی بنیاد ہی نہیں رکھی تھی بلکہ قدیم جو ہی دین کی جگہ نئے زردشتی دین کی بھی تحریزی کی تھی۔ وہ ایران کی نئی شہنشاہی اور نئے دین دونوں کا بانی تھا۔

زردست (یازر تشت) کی ہستی کی طرح اس کے ظہور کا زمانہ اور محل بھی تاریخ کا ایک مختلف نیہ موضوع بن گیا ہے۔ اور انیسویں صدی کا پورا زمانہ مختلف نظریوں اور قیاسوں کی روکردن میں بسرا ہو چکا ہے۔ بعضوں کو اس کی تاریخی ہستی ہی سے انکار ہوا۔ بعضوں نے شاہنامہ کی روایت کو ترجیح اور گشتسپ (جسے یونانیوں نے Hystaspes کا نام دیا) والا قصہ درست تسلیم کر لیا، بعضوں نے اس کا زمانہ ایک ہزار برس قبل مسیح قرار دیا۔ بعضوں نے یہ مدت دو ہزار برس قبل مسیح تک بڑھا دی۔ اسی طرح اس کے محل کے تعین میں بھی اختلاف ہوا۔ بعضوں نے باختہ، بعضوں نے خراسان، بعضوں نے میڈیا اور شمالی ایران قرار دیا۔ لیکن اب بیسویں صدی کی ابتداء سے اکثر محققین اور تاریخ دان اس رائے پر متفق ہو گئے ہیں اور عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ زردشت کا زمانہ وہی تھا جو سائرس کا تھا۔ اور گشتسپ والی روایت اگر صحیح ہے تو اس سے مقصود ہی گشتسپ ہے، جو دارا کا باپ اور ایک صوبہ کا گورنر تھا۔ زردشت کا ظہور شمال مغربی ایران یعنی آذربایجان میں ہوا جیسا کہ اوستا (Avesta) کے حصہ ویندی داد میں تفصیل سے واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

البتہ کامیابی باختہ میں ہوئی۔ جس کا گورنر گشتسپ کا تھا۔

تحقیق کے مطابق زردشت کا سال وفات تقریباً ۵۵۰ قبل مسیح سے لے کر ۵۸۳ قبل مسیح تک ہونا چاہیے۔ اور سائرس کی تخت نشینی بالاتفاق پانچ سو پچاس قبل مسیح میں ہوئی، یعنی زردشت کی وفات کے تیس سال بعد یا عین اسی سال۔ لیکن اگر سائرس زردشت کا معاصر تھا تو کیا کوئی براہ راست تاریخی شہادت موجود ہے۔ جس سے اس کا دین زردشتی قبول کرنا ثابت ہو؟ نہیں ہے، لیکن اگر وہ تمام قرآن جمع کئے جائیں جو خود تاریخ کی روشنی نے مہیا کر دیے ہیں تو یقیناً ایک بالواسطہ شہادت نمایاں ہو جاتی ہے اور اس میں کچھ شہبادی نہیں رہتا کہ سائرس نہ صرف دین زردشتی پر عامل تھا بلکہ اس کا پہلا حکمران داعی تھا۔ اور اس نے یہ ورثہ اپنے جانشینوں کے لیے چھوڑا جو دوسو برس تک بلا استثناء دین زردشتی پر عمل پیرا رہے۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ روشنی جنم واقعات سے پڑتی ہے وہ دو ہیں۔ اور دونوں کی تاریخی نوعیت مُسلم ہے۔ پہلا واقعہ گوماتہ کی بغاوت کا ہے جو سائرس کی وفات کے آٹھ برس بعد ظہور میں آئی۔ دوسرا دارا کے وہ کتبے ہیں، جن سے اس کے دینی عقائد کی نوعیت آشکار ہو گئی ہے سائرس کا بالاتفاق پانچ سو انتیس قبل از مسیح میں انتقال ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا کمبی سیز (کمبوچیہ یا لیقباً) تخت نشین ہوا۔ اس نے پانچ سو پچسیں قبل مسیح میں مصطفیٰ کیا۔ لیکن ابھی مصر میں ہی تھا کہ یہ معلوم ہوا کہ ایران میں بغاوت ہو گئی ہے۔ اور ایک شخص، گوماتہ نامی نے اپنے آپ کو سائرس کا دوسرا اٹھ کا سردار (فارسی: برویہ) مشہور کر دیا ہے۔ جو بہت پہلے مرچ کا تھا یا مارڈا لا گیا تھا۔

یہ خبر سن کر وہ مصر سے لوٹا۔ لیکن انھی شام میں تھا کہ پانچ سو بائیس قبل از مسیح میں اچاک انتقال کر گیا۔ اب چوں کہ سارس کی برادر است نسل سے کوئی شہزادہ موجود نہ تھا۔ اس نے اس کا عزم زاد بھائی دارا، ابن گشتاسپ تخت نشین ہو گیا۔ دارا نے بغادت فروکی۔ گوماتہ کو قتل کیا اور نئی مملکت کو اس کے عروج و کمال تک پہنچا دیا۔ دارا کی تخت نشینی بالاتفاق پانچ سو کیس قبل مسیح میں ہوئی تھی۔ پس اس کا عہد سارس کے انتقال سے آٹھ برس بعد شروع ہو گیا تھا۔ یونانی مورخوں کی شہادت موجود ہے کہ یہ بغادت میڈیا کے قدیم مذہب کے پیروؤں کی بغادت تھی اور خود دارا، اپنے کتبہ بے ستون میں گوماتہ کو "مو گوش" لکھتا ہے یعنی جوس۔ اور جوسی مذہب سے مقصود قدیم مذہب ہے۔ مو گوش کا لفظ ایک جگہ استامیں بھی آیا ہے اور اب یہ بات بالاتفاق قطعی طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ مو گوش سے مقصود میڈیا کے اس مذہب کے پیروؤں جو زردشت کے ظہور سے پہلے وہاں رانج تھا۔ چوں کہ میڈیا کے باشندے بابل اور شام میں مو گوش کے نام سے مشہور ہو چکے تھے اس لیے عربوں میں بھی یہی نام مشہور ہو گیا اور یوں مو گوش نے جوس کی شکل اختیار کر لی۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ تمام ایرانیوں کو جوسی ہی کہا جانے لگا۔ زردشتی اور غیر زردشتی کا امتیاز بالکل ختم ہی ہو کر رہ گیا۔ حال آں کہ اصلًا جوسی، زردشتی مذہب کے ماننے والوں کے دشمن تھے۔

تاریخ میں اس کا بھی سراغ ملتا ہے کہ پرانے مذہب کے پیروؤں کی سرکشی دارا کے ہاتھوں اس گوماتہ کی سرکوبی کے بعد بھی جاری رہی۔ چنانچہ دوسری بغادت "پر اور تیش" نامی جوسی نے کی تھی، جسے دارا نے ہمان میں قتل کیا۔ اور تیسرا "چرت خم" نامی نے جوار بیل میں قتل ہوا۔ دوسرے اتعہ دارا کے کتبوں سے روشنی میں آیا ہے۔ یہ دنیا کی خوش قسمتی ہے کہ دارا نے بعض بعض کتبے پہاڑوں کی محکم چٹانوں پر نقش کرائے جنہیں سکندر کا حملہ بھی بر بادنہ کر سکا۔ ان میں سب سے اہم کتبہ کوہ بے ستون کا ہے۔ جس میں دارا نے گوماتہ جوسی کی بغادت اور اپنی تخت نشینی کی سرگزشت قلم بند کی ہے۔ جب کہ دوسری کتبہ استخراج کا ہے۔ جس میں دارا نے اپنے تمام تھت ممالک کے نام گنوائے ہیں۔ ان دونوں میں وہ بار بار "اہور موزدہ" کا نام لیتا ہے۔ اور اپنی تمام کام رانیوں کو اس کے فضل و کرم سے منسوب کرتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اہور موزدہ کا شکردا کرتا ہے۔ اور ہر خوبی، کامیابی اور سرفرازی کا انتساب اسی کے نام کرتا ہے۔ اور یہ بات واضح رہے کہ "اہور موزدہ"، زردشت کی تعلیمات کے مطابق ہمارے خدا ہی کا نام ہے۔

ان دو واقعوں پر ایک تیسرا واقعہ کا بھی اضافہ کر دینا چاہیے۔ یعنی تاریخ میں کوئی اشارہ اس بات کا نہیں ملتا کہ کمبی سیز نے کوئی نیادین قبول کیا تھا۔ یا، دارا کو اس طرح کا کوئی معاملہ پیش آیا تھا۔ ہیر و ڈوٹس نے دارا کی وفات کے پچاس ساٹھ برس بعد اپنی تاریخ لکھی ہے۔ (دارا کی وفات بالاتفاق ۲۸۲ قبل مسیح میں ہوئی۔ اور ہیر و ڈوٹس ۲۸۳ قبل از مسیح میں پیدا ہوا تھا۔ یعنی دارا کی وفات سے صرف دو سال بعد)۔ اس نے دارا کے عہد کے واقعات ہیر و ڈوٹس کے لیے بالکل قریبی زمانے کے واقعات تھے۔ اور لیڈیا میں فارسی حکومت قائم ہو جانے کی وجہ سے یونانیوں اور فارسیوں کے تعلقات بھی روز بروز بڑھ رہے تھے۔ تاہم وہ کسی ایسے واقعہ کا ذکر نہیں کرتا۔

پس سارس کی وفات اور دارا کی تخت نشینی کے درمیان آٹھ برس کی جو مدت گزری ہے۔ ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس عرصے میں کسی نئی مذہبی دعوت کے ظہور و قبول کا کوئی واقعہ نہیں گزرا۔ اب غور فرمائیے۔ ان واقعات کا لازمی نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ اگر سارس کے بعد کمبی سیز اور دارا نے کوئی نئی دعوت قبول نہیں کی تھی اور دارا دین زردشتی پر عامل تھا۔ تو کیا اس سے ثابت نہیں ہو رہا کہ دارا اور کمبی سیز سے پہلے ہی زردشتی دین، اس

خاندان میں آپ کا تھا؟ اگر سائزس کی وفات کے چند سال بعد قدیم مذہب کے پیر و اس نے بغاوت کرتے ہیں کہ کیوں ایک نیا مذہب قبول کر لیا گیا تو کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ سائزس نیا مذہب قبول کر چکا تھا۔ اور تبدیلی مذہب کا معاملہ نیا نیا پیش آیا تھا؟ پھر اگر زردشت سائزس کا معاصر تھا تو کیا یہ اس بات کا مزید ثبوت نہیں ہے کہ سب پہلے سائزس ہی نے یہ دعوت قبول کی تھی اور وہ فارس اور میڈیا کا نیا شہنشاہ بھی تھا اور نئی دعوت کا پہلا حکمران داعی بھی؟

زردشت اور سائزس

اتنا ہی نہیں، بلکہ ہم غور کرتے ہیں، تو اس زنجیر کی کڑیاں اور آگے کنک بڑھتی جاتی ہیں۔ البتہ ہم اسے ایک قیاس سے زیادہ کہنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ اگر سائزس زردشت کا معاصر تھا اور سائزس کا ابتدائی زمانہ خاندان سے الگ اور گمنامی میں بسر ہوا، تو کیا اس زمانہ میں دونوں شخصیتیں ایک دوسرے کے قریب نہیں پہنچ جاتیں؟ اور کیا ایسا نہیں سمجھا جا سکتا کہ اسی زمانہ میں سائزس، زردشت کی تعلیم و صحبت سے بہرہ مند ہوا؟ سائزس کی ابتدائی زندگی کی سرگزشت تاریخ کی ایک گم شدہ داستان ہے۔ پھر کیا اس داستان کا سراغ ہمیں ان دونوں شخصیتوں کی معاصرت کے واقعہ میں نہیں مل جاتا؟

مورخ زینو فن نے سائزس کی ابتدائی زندگی کا افسانہ ہمیں سنایا ہے۔ اس افسانہ میں ایک پر اسرار شخص کی پر چھائیاں واضح اور صاف نظر آ رہی ہیں، جو دشت و جبل کے اس پروردہ قدرت کو آنے والے کارناموں کے لیے تیار کر رہا تھا۔ کیا اس پر چھائیں میں ہم خود زردشت کی مقدس شخصیت کی نمود نہیں دیکھ رہے؟ اگر زردشت کا ظہور شمال مغربی ایران میں ہوا تھا اور اگر سائزس کی ابتدائی گمنامی کا زمانہ بھی شمالی کوہستان میں بسر ہوا، تو کیوں یہ دونوں کڑیاں باہم مل کر ایک گم شدہ داستان کا سراغ نہ بن جائیں؟

سائزس کی شخصیت وقت کے تمام ذہنی اور اخلاقی رجحانات کے برخلاف ایک انقلاب انگیز شخصیت تھی۔ ایسی شخصیت کسی انقلاب انگیز داعی کی دعوت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اور صاف نظر آ رہا ہے۔ کہ وہ داعی شخصیت زردشت ہی کی تھی۔ بہر حال، سائزس نے اپنی ابتدائی گمنامی کے عہد میں نئی دعوت قبول کی ہو، یا تخت نشینی کے بعد، لیکن یہ قطعی ہے کہ وہ دین زردشتی پر عامل تھا۔ دین زردشتی کی حقیقی تعلیم

لیکن اگر ذوالقرنین دین زردشتی پر عامل تھا۔ اور قرآن ذوالقرنین کے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا اثبات کرتا ہے، اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اسے اللہ کی جانب سے الہام یافتہ بھی قرار دیتا ہے۔ (سورہ کہف: آیت 86)

تو کیا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ زردشت کی تعلیم دین حق کی تعلیم تھی؟ یقیناً لازم آتا ہے۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ اس لزوم سے پہنچنے کی ہم کو شش کریں کیوں کہ یہ حقیقت اب اور پوری طرح روشنی میں آچکی ہے کہ زردشت کی تعلیم سرتاسر خدا پرستی اور نیک عملی کی تعلیم تھی۔ اور آتش پرستی اور شنویت (یعنی دو خداوں) کا اعتقاد اس کا پیدا کیا ہوا اعتقد نہیں ہے۔ بلکہ قدیم میڈیا کی مجوہ سیت کار د عمل ہے۔

جس طرح روم کی میسیحیت، قدیم رویت پرستی کے رد عمل سے محفوظ نہ رہ سکی۔ اسی طرح زردشت کی خالص خدا پرستانہ تعلیم بھی قدیم مجوہ سیت کے رد عمل سے نجٹ نہ سکی۔ خصوصاً ساسانی عہد میں جب وہ از سر نمودون ہوئی تو اصل تعلیم سے بالکل ایک مختلف چیز بن چکی تھی۔

زردشت کے ظہور سے پہلے فارس اور میڈیا کے باشندوں کے عقائد کی بھی نوعیت وہی تھی جو انڈو یورپین آریاؤں کی تمام دوسری شاخوں کی رہ چکی ہے۔ ہندوستان کے آریاؤں کی طرح ایران کے آریاؤں میں بھی پہلے مظاہر قدرت کی پرستش شروع ہوئی۔ پھر سورج کی عظمت کا تصور پیدا ہوا۔ پھر زمین میں آگ نے سورج کی قائم مقامی پیدا کر لی، کیوں کہ تمام مادی عناصر میں روشنی اور حرارت کا سرچشمہ وہی تھی۔ یونانیوں میں ایسے دیوتاؤں کا تصور پیدا ہوا جن سے اچھائی اور برائی دونوں ظہور میں آتی تھیں۔ لیکن ایرانیوں کے تصور نے دیوتاؤں کو دو مقابل قوتوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک قوت پاک، جب کہ دوسری قوت برائی کے عفريتوں کی تھی جو نوع انسانی کے جانی دشمن تھے۔ روحاںی ہستیوں کی نمود روشنی میں ہوئی اور شیطانوں کی تاریکی میں۔ نور و ظلمت کی یہی کشکش ہے جس سے تمام اچھے برے حادث ظہور میں آتے ہیں۔ چونکہ روشنی پاک روحاںیتوں کی نمود ہے۔ اس لئے ہر طرح کی عبادتیں اور قربانیاں اس کے لیے ہونی چاہئیں۔ اس روشنی کا مظہر آسمان میں سورج اور زمین میں آگ تھی۔ اچھائی اور برائی کا جس قدر تصور تھا، وہ یونانیوں کی طرح صرف مادی زندگی کی راحتوں اور محرومیوں ہی میں محدود تھا۔ روحاںی زندگی اور اس کی سعادت و شقاوت کا کوئی تصور پیدا انہیں ہوا تھا۔

آگ کی پرستش کی قربان گاہیں بنائی جاتی تھیں۔ اور اس کے خاص پچاریوں کا ایک مقدس گروہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے افراد موگوش کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ آگے چل کر اس لقب نے آتش پرستی کا مفہوم پیدا کر لیا۔ لیکن زردشت نے ان تمام باطل عقائد کا انکار کر دیا۔